U41334

13-12-

Title - AAP BEETI

Creator - Khwaja Hasan Nizami

Publisher - Printing works (Delhi).

Date - 1922 H

Pages - 140

Subjects - Aap Beeti - Khwaja Hasan Nizami
Khud Nawisht - Khwaja Hasan
Nizami.

هو الحق   یا معین

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی مدظلہ

کی خود اپنی لکھی ہوئی

آپ بیتی

نومبر سنہ ۱۹۲۲ء

میں دوسری بار

راز ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی

نے

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع کی

شروع خدا کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

دیباچوں کا دیباچہ

اس کتاب پر تین آدمیوں نے دیباچے لکھے ہیں۔ پہلا خواجہ بانو نے دوسرا واحدی صاحب نے تیسرا بھیا احسان نے۔

بھیا احسان بہت تفصیل سے لکھنے کا قصد رکھتے تھے مگر بیمار ہو گئے اور بحالت بخار یہ مختصر سا دیباچہ لکھ سکے امید کے موافق انہوں نے اس کتاب کے نقائص پر اعتراض بھی کئے ہیں لیکن زیادہ لطف جب آتا کہ وہ خود میری ذات پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے جس پر وہ پوری طرح آمادہ تھے۔ خدا کو منظور ہے تو کتاب ہذا کے طبع دوم کے وقت میں انکی نکتہ چینی حاصل کر کے شائع کردوں گا۔

بھیا احسان نے جو لکھا ہے اس میں ایک بات اس قابل ہے کہ میں اسکی تشریح بیان کر دوں نہ ورنہ ناواقف لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گی۔

اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر اچھے برے واقعہ کو اس کتاب میں لکھدیا تھا۔ کتاب کے شروع میں اس کا اشارہ بھی میں نے کیا ہے کہ زندگی کے عیب و صواب سب لکھنے چاہتا ہوں چنانچہ ایسی ہوا اور کوئی مخفی سے مخفی بات میں نے باقی نہ رکھی سب کچھ ظاہر کر دیا۔ اس کی خبر صوبہ بمبئی کے تعلیم یافتہ مریدوں کو ہو گئی کہ میں اس قسم کی آزادانہ کتاب لکھ رہا ہوں تو انہوں نے شدو مد سے مخالفت کی۔ اور لکھ

جن کے اظہار سے نفع نہیں ہوتا۔ بلکہ بندگان خدا کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

دہلی میں واحدی صاحب اور بھیا احسان کی رائے تھی اور خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ خدا کی مخلوق کے سامنے میری وہی صورت پیش ہو جیسی کہ وہ تھی یا جیسی کہ وہ روکنے والے جواب دیتے تھے کہ جو تھا وہ گزر گیا اس کے ذکر کی ضرورت نہیں جو موجود ہے اسیکا تذکرہ کافی ہے۔

بمبئی میں اتفاق سے گجرات و کاٹھیاواڑ کے تمام چیدہ و منتخب مرید جو باعتبار زمانہ شناسی اور نئی تعلیم کے کمالات کے چیدہ و منتخب کہے جا سکتے ہیں۔ جمع تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں سے اکثر میری ابتدائی حالت کے شریک اور رازدار رہ چکے مثلاً غلام نظام الدین قریشی پریمی احمد آبادی۔ رضا الحق عباسی پرائیویٹ سکریٹری نواب صاحب منگرول۔ ولی محمد مومن پرائیویٹ سکریٹری ریاست ماناودر اور نواب فیض محمد خان آف کھمبائت۔ چاند میاں بی۔ اے۔ آف کھمبات وغیرہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ آپ بیتی کا مسئلہ پیش ہوا۔ اور اہل مجلس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک فریق کہتا تھا سب کچھ درج ہونا چاہیئے۔ اس کے سرغنہ مسٹر ولی محمد مومن تھے۔ دوسرا کہتا تھا کچھ ہونا چاہیئے۔ اس کے لیڈر مسٹر رضا الحق عباسی تھے۔ دونوں کی دلیلیں زبردست تھیں۔ آخر فیصلہ کچھ نہ ہوا۔ اور میری مرضی پر بات منحصر رہی۔

میرے فاضل دوست جناب مولوی عبدالماجد صاحب مصنف فلسفۂ جذبات و فلسفہ اجتماع وغیرہ نے بھی یہی رائے دی کہ سب واقعات بے کم و کاست ہونے ضروری ہیں۔ اس سے مجھے تقویت ہوئی۔ اور میں نے آپ بیتی لکھنے کو دیدی۔ اسی اثنا میں حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب جج الہ آباد کا حکم پہنچا کہ جن سے میں نے مشورہ لیا تھا۔ کہ وہ واقعات ہرگز درج نہ کیئے جائیں ان سے کچھ حاصل نہیں۔ حضرت اکبر کے ارشاد کے بعد میں مجبور ہو گیا۔ کیونکہ میرے عقیدہ میں انکی رائے

نام ہندوستان کے باشندوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ وزنی تھی۔ اسی زمانہ میں جناب اللہ بندی عرف امی صاحبہ نے ریاست کوٹہ سے حضرت اکبر کی تائید میں ایک مستند خط لکھا جسمیں آیات و احادیث و اقوال مشائخ کے حوالے جمع کرکے مجھ کو اس حرکت سے روکا گیا تھا۔ امی صاحبہ عالمہ ہیں فاضلہ ہیں اور کوچہ تصوف میں بڑے پایہ کی کاملہ اور عارفہ ہیں۔ ان دو خطوط کو دیکھنے کے بعد میں نے مجبوراً بادل ناخواستہ کاپی نویس کو منع کردیا کہ ان حالات کو کتاب میں نہ لکھا جائے۔

واحدی صاحب اور بھیا احسان کو اس کا افسوس ہوا۔ اور بھیا احسان نے آخر دیباچہ میں اس کا ذکر کر ہی دیا۔

جناب غلام نظام الدین صاحب خاکسار عالم تاجر کتب جن کے نام یہ کتاب منسوب ہے اور جن کا حال کتاب ہذا سے اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔ انہی تفصیل سے بھی ناراض ہوئے جو میں نے اس کتاب میں لکھدی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ چوری کرنے کا ذکر اور جوتیوں پر بیٹھنے کا اظہار میری شان موجودہ کے سراسر منافی ہے اس سے میرے دشمن مجھ کو ذلیل اور حقیر خیال کریں گے۔

جناب خاکسار صاحب نے یہ رائے جس سچی محبت سے دی اس کا میں شکرگزار ہوں کیونکہ ان کی نظر میں میری بہت بڑی شان اور عزت ہے مگر میں خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ میں کسی شان کا مستحق بھی نہیں ہوں اور احباب میں جو کچھ حسن ظن میری نسبت قائم ہو گیا ہے یہ سب خدا کے فضل سے ہے۔

میں نے سب کچھ اس کتاب میں لکھدیا ہے اور جو رہ گیا وہ کچھ اتنا اہم نہ تھا کہ جس کے نہونے سے کتاب ناقص سمجھی جائے۔

مرنے کے بعد ہر شخص کے حالات پر بحث کی جاتی ہے اگر اس کا تعلق پبلک سے رہا ہو مگر یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے زندگی میں اپنی نسبت لوگوں کو شدید اور پرجوش

مباحثہ کرتے ہوئے سن لیا اور دیکھ لیا اور جو لطف مرنے کے بعد روح کو آتا وہ مجھ کو جسم و روح کے اجتماع میں حاصل ہو گیا۔

ترتیب وغیرہ کی نسبت بھیا کی رائے صحیح ہے کہ جلدی میں بعض خامیاں اس کتاب کی درست نہ ہو سکیں۔ اب میں خدا کا شکر اور خواجہ بانو اور واحدی صاحب اور بھیا احسان کے دیباچوں کی نسبت اپنی ممنونیت ادا کرکے اردو زبان میں آپ بیتی لکھنے کا افتتاح کرتا ہوں۔ تاکہ اس ابتدائی نقشہ و خاکہ پر دوسرے لوگ بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرکے دکھائیں۔

(حسن نظامی)

پہلا دیباچہ

(از جناب لیلےٰ خواجہ بانو صاحبہ)

خدا کا شکر ہے کہ جو باتیں ہم زبانی سنا کرتے تھے ان میں سے بعض اس کتاب میں جمع ہو گئیں خواجہ صاحب کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ ہر آدمی کی زندگی خود اس کے لیے اور دوسروں کے واسطے نصیحت ہے اگر وہ اس پر غور کرے۔ یہ کتاب بھی ایک نصیحت نامہ ہے۔

لاہوتی آپ بیتی

کو میں بالکل نہیں سمجھی اور شاید بہت کم آدمی اسکو سمجھیں گے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید خواجہ صاحب ہندوؤں کی طرح آواگون کے قایل ہیں کیونکہ آپ بیتی لاہوتی کے پڑھنے سے یہی شبہ ہوتا ہے۔ جب پوچھا تو انھوں نے کہہ دیا۔ نہیں میں تناسخ یا آواگون کا قایل نہیں ہوں میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ کسی اور چیز کا بیان ہے۔ لاہوتی آپ بیتی اب کتاب ہذا سے علیحدہ چھاپی گئی ہے۔

(حسن نظامی)

اپنی بہنوں سے کہتی ہوں!

جو اس کتاب کو پڑھیں کہ وہ بھی اس طرح اپنی زندگی پر غور کیا کریں۔

جو بہنیں میرے پیر اور میرے شوہر خواجہ صاحب کی مرید ہیں ان سے میرا کہنا یہ ہے کہ اور عورتوں کو بھی یہ کتاب پڑھ کر سنایا کریں۔ تاکہ ان کو بھی اس زندگی کے بیان سے نصیحت حاصل ہو۔

پیر مرید کی چاہت

یہ ہوتی ہے کہ سب آدمی اس کے پیر کے مرید ہو جائیں میری پیر بہنوں کو بھی چاہیئے کہ اپنی جان پہچان عورتوں کو اپنے پیر کے حالات کی یہ کتاب سنا کر اپنی پیر بہن بنائیں کہ جتنی زیادہ گنتی ہماری پیر بہنوں کی ہوگی اتنی ہی زیادہ آپس کی محبت بڑھے گی کیونکہ پیر بہنوں میں ماجائی بہنوں سے بھی زیادہ محبت ہوتی ہے۔

اس کتاب سے میں نے کیا حاصل کیا

میں نے اس کتاب سے یہ حاصل کیا کہ آدمی کو اپنا بُرا اور تکلیف کا وقت اچھے اور خوشی کے زمانہ میں یاد کرنا چاہیئے اس سے اسکو غرور نہیں ہوتا۔

اور یہ حاصل کیا کہ آدمی وہی ہے جو نکما نہیں رہتا اور کام میں وقت خرچ کرتا ہے

اور یہ حاصل کیا کہ بناوٹ اور ریاکاری اور دکھاوے کے بغیر بھی سیدھی سادی زندگی رکھنے سے آدمی دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور یہ حاصل کیا کہ پیر لوگ اگر خواجہ صاحب کی طرح محنت مشقت سے روزی کمایا کریں اور مریدوں کی نذر و نیاز کا خیال نہ کریں تو وہ بھی نصیحت کرنے میں بے خوف ہو جائیں۔ خدا مجھکو اور میرے بچوں حسین نظامی و ولی ہال و روح بانو اور مسلمان عورتوں اور بچوں اور مردوں کو دنیا میں آپکی توفیق دے کہ آپ کی بخشی ہوئی زندگی کی قدر کریں اور آپکی عبادت اور آپ کے بندوں کی خدمت کا حق ہم سے ادا ہو۔ آمین ۝

خاکسار لیلیٰ۔ خواجہ بانو

دوسرا دیباچہ

(از جناب ملا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر اخبار خطیب و رسالہ نظام المشائخ دہلی)

سیدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی کی تحریر میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں اور خوبیاں کیا وہ ایک البیلے سٹائل کے بانی اور خاتم ہیں وہاں ایک خصوصی و امتیازی خوبی اور صفت یہ بھی ہے کہ ان کو سب انوکھے اور نرالے مضمون سوجھتے ہیں اور جن عنوانوں پر دوسرا قلم نہیں اٹھا سکتا۔ ان پر یہ صفحے کے صفحے رنگ ڈالتے ہیں اس طرح کہ ہر سطر اور ہر لفظ کیفیت و اثر میں ڈوبا ہوتا ہے۔ کتاب ہذا اسی شہنشاہ قلم کی آپ بیتی خود نوشت سوانحعمری یا بایوگرافی ہے، پھر سمجھ لیجئے کہ اس میں کچھ دلچسپی کے سامان نہ ہوں گے۔ میں نے آپ بیتی خواجہ حسن نظامی کو سرسری نظر سے دیکھا۔ میرے نزدیک کم از کم اردو لٹریچر میں یہ بالکل جدید اضافہ ہے۔ آپ بیتی خواجہ حسن نظامی کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں ہمکو صرف ندرت و جدت کو تلاش کرنا چاہیئے۔ اول تو جیسا اوپر کہہ چکا ہوں۔ خود نوشت سوانحعمری کا ہمارے ہاں دستور ہی کہاں ہے۔ علاوہ ازیں آپ بیتی خواجہ حسن نظامی جیسی بایوگرافی تو قطعی اپنی زبان میں آپ کسی کی پیش نہیں کر سکتے آپ بیتی میں خواجہ صاحب نے اپنے عیب و ہنر کو اتنی صفائی سے بیان کیا ہے کہ ان کے سوا اتنی صفائی برتنے والا مشکل سے ملیگا۔ آپ بیتی خواجہ صاحب نے خاص طور سے اپنے مریدوں کے لیئے طیار کی ہے اور اسکی طیاری میں از ابتدا تا انتہا مریدان کے سامنے رہے ہیں لیکن غیر مرید بھی اس سے مریدوں کے برابر حظ و فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لوگ فرضی افسانوں سے اخلاقی نتائج نکالتے ہیں اور دنیا ان سے محظوظ و مستفید ہوتی ہے مگر کاش ہم حقیقی زندگیوں سے سبق سیکھنے کے عادی ہو جائیں کہ وہ بہترین افسانہ اور بہترین ناصح ہیں۔ یہ تو ہمہ شما کی زندگی کا حال تھا۔ نامور دل اور خدا بخش

کی زندگی کا ذکر کیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی گو بڑے برگزیدہ خاندان کے فرد ہیں پر پیدا جب ہوئے کہ اس خاندان کی برگزیدگی خاک میں مل چکی تھی۔

سونے سے سونا نکلے تو تعجب نہیں لیکن خاک سے سونے کا نکلنا بڑی بات ہے خواجہ صاحب سونا ہیں جو خاک سے نمودار ہوئے۔ ان کی زندگی کا معمولی سے معمولی واقعہ سبق آموز ہے۔ نصائح کا گنجینہ ہے۔

صاحبانِ عزت و ثروت کی اولاد آج ہزار کوشش و سعی کے باوجود بزرگوں کی عزت و ثروت کو مٹائے دیتی ہے۔ مگر خواجہ صاحب کی زندگی بتاتی ہے کہ غریبوں کے بچے اگر تعلیم و تربیت پا سکیں تو ان میں ترقی کی کیا کچھ اہلیت ہے۔ خواجہ صاحب نے حسبِ عادت زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات لے لیئے ہیں اور قریباً کل واقعات سے ایک نتیجہ نکال کر بتلایا ہے آپ بیتی گویا متعدد اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جن سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں مسلسل مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ہمیں ہماری زندگی کے راستے میں روشنی دکھاتا ہے۔ اردو کی گلستاں ہے۔ تجربات حیات ہے۔ کتاب النصائح ہے کتاب الاصلاح ہے۔

عبدالماجد

واحدی

تیسرا دیباچہ

(از جناب مولوی شیخ محمد احسان الحق صاحب قادری ایڈیٹر رسالہ اسوۂ حسنہ دہلی)

مصور فطرت سیدی حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے فن انشا پردازی میں جو قابل رشک کمال پیدا کیا ہے اس کے خد و خال کو نمایاں کرنے کے لیئے ایک طویل مضمون اور مستقل بحث کی ضرورت ہے اور اس فرض کو وہ حضرات جو زیادہ اہل ہیں مناسب موقعوں پر کچھ ادا کر چکے ہیں اور آیندہ ادا کرینگے۔ میں یہاں صرف آپ بیتی تک اپنی رائے زنی کو محدود رکھ کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ کیسی کتاب ہے اسکی اشاعت سے اردو علم ادب اور قوم و ملک کو کیا نفع ہوگا اور اسکی تالیف و تحریر میں خواجہ صاحب سے کہاں کہاں لغزشیں ہوئی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اردو کے کسی مشہور مصنف یا باکمال انشا پرداز نے اپنی مبسوط سوانحعمری خود لکھ کر ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع نہیں کی۔ اس لحاظ سے آپ بیتی کی اشاعت اردو علم ادب میں ایک نئی اور قیمتی دلچسپی کا اضافہ کرے گی اور یہ دلچسپی ایسی مفید ہوگی کہ اس کے لیئے حامیان ادب اردو کو یقیناً خواجہ صاحب کا ممنون ہونا پڑے گا۔

خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات شروع سے آخر تک نہ صرف دلچسپ بلکہ سبق آموز اور مفید بھی ہیں کیونکہ خواجہ صاحب بھی ہندوستان کے ان چند منتخب نفوس میں ہیں جنکو انگریزی میں "سلف میڈ"، کہا جاتا ہے یعنی ممدوح نے غریب اور علم و دولت خیالی سے تقریباً بے بہرہ سرپرستوں کی نگرانی میں معمولی تربیت پاکر اور سخت عسرت و گمنامی کی حالت سے خود ترقی کر کے حاسدوں کی شدید مخالفتوں کے باوجود اس بام شہرت و کمال پر اپنا جھنڈا نصب کیا ہے جسکی طرف دیکھنے سے ان کے حریفوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جسکی آستاں بوسی کو

آج دولتمند بھی باعث فخر سمجھتے ہیں اور علم پرست بھی۔ پھر یہ تمام عروج و کمال جو خواجہ صاحب کو حاصل ہوا ہے صرف ان کی فطری و کسبی قابلیت و ذاتی کوششوں کا رہین منت ہے۔ کہ کسی اتفاقیہ خوش قسمتی یا دوسروں کی غیر معمولی دستگیری کا۔ ایسے لوگوں کے حالات جو خود اپنی کوشش و قابلیت سے ترقی کرکے انتہائی پستی سے معراج کمال پر پہنچتے ہیں اول تو عموماً خود ہی سبق آموز اور مفید ہوا کرتے ہیں لیکن جس ناصحانہ رنگ میں اپنے مختلف الحیثیت حالات کو خواجہ صاحب نے تحریر کیا ہے اور جس مصلحانہ اہتمام کے ساتھ ان سے نتائج اخذ کرکے مریدوں اور متوسلوں کو مستفید کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی آپ بیتی اصلاحی اعتبار سے اور بھی زیادہ قابل قدر ہوگئی ہے جو ہمارے سامنے ایک مختلف کمالات رکھنے والے بزرگ کی کامیاب زندگی کا نمونہ پیش کرکے خود ہمکو بہترین طریقہ سے کامیاب بننے کی تلقین کر رہی ہے "سلف میڈ" لوگوں کی سوانح عمریوں کے مطالعہ کو زندہ قومیں اپنی ضروریات زندگی میں شمار کرتی ہیں اسلئے خواجہ صاحب جیسے "سلف میڈ" بزرگ کی خودنوشت سوانحعمری آپ بیتی اردو میں ایک ایسی کتاب ہوگی جسکو غیر اردو داں قومیں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گی اور جسکی ضرورت اور نفع رسانی ہمارے ملک میں روز بروز بڑھتی جائے گی۔

خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے کل حالات من وعن اور بے کم و کاست لکھے ہیں یا نہیں اور ان کو قلمبند کرنے میں ذاتی یا اجتماعی مصلحتوں کی بناپر کچھ قطع و برید کی ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب آپ بیتی کے ان پڑھنے والوں کو جو خواجہ صاحب کے حالات سے بطور خود واقف نہیں ہیں۔ آپ بیتی میں مشکل سے ملیگا لیکن جو لوگ خواجہ صاحب کے ساتھ عرصہ سے دوستانہ یا نیاز مندانہ تعلقات رکھتے ہیں وہ بلا تامل یہ کہدینگے کہ حالات مکمل نہیں ہیں اور ان میں کچھ قطع و برید بھی ہوئی ہے اور یہی میرے نزدیک آپ بیتی میں وہ سب سے بڑا نقص ہے جس نے

گو اسکی نفع رسانی اور دلچسپی پر شاید زیادہ مضر اثر نہیں ڈالا ہے۔ لیکن اس کے موضوع تالیف یعنی تاریخی اہمیت کو یقیناً گھٹا دیا ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ خواجہ صاحب نے انتہائی جرأت و صداقت سے کام لے کر اپنے تمام حالات کو من و عن قلمبند کر لیا تھا لیکن بعض بزرگوں اور دوستوں کے سخت اصرار پر ان کو کچھ حصّے مسودہ میں سے علیحدہ کرنے پڑے اور کچھ حصوں پر نظرثانی کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کاش اس کتاب کا مسودہ اپنی اصلی شکل میں برقرار رہتا اور بزرگان و احباب کی مصلحتیں اس کی تاریخی اہمیت کا خون نہ کرنے پاتیں۔ خواجہ صاحب اور ان کے بعض دوستوں کو اس کا احساس نہ ہو لیکن مجھ کو یقین ہے کہ ان کی زندگی اپنے دلچسپ نشیب و فراز میں بہت سی تاریخی اہمیتیں پوشیدہ اور نمایاں رکھتی ہے اور جو داغ دھبے آج بعض لوگوں کو ہمیں سیاہ و بدنما نظر آتے ہیں وہ بھی آئندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ بحالت موجودہ بھی خواجہ صاحب نے اپنی عیب نمائی میں بہت ہی غیر معمولی جرأت و صداقت سے کام لیا ہے اور آجکل ان کی حیثیت کے کسی شخص سے اتنی جرأت و صداقت کے اظہار کی بہت کم توقع ہو سکتی ہے لیکن میں آپ بیتی کو بہت زیادہ قابل قدر بلکہ دنیا کی ایک بہترین کتاب سمجھتا اگر وہ حصے بھی جو مسودہ میں سے خارج کر دیئے گئے ہیں اس میں شائع کر دیئے جاتے۔

جس جرأت و صداقت کے ساتھ خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں اپنے عیبوں کو ظاہر کیا ہے افسوس ہے کہ اپنی خوبیاں بیان کرنے میں اتنی جرأت و صداقت سے کام نہیں لیا۔ عجز و انکسار کے جذبہ اور خودستائی کا الزام آنے کے اندیشہ نے ان کو اپنی بہت سی واقعی خوبیوں کے اظہار سے باز رکھا ہے اور جہاں کچھ خوبیاں بیان کی ہیں وہاں ان کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے بھی

آپ کو کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرنی پڑی ہے۔ اپنی سوانح عمری آپ لکھنے والوں کو اس قسم کی دقتیں ضرور پیش آتی ہیں۔ اس لیئے ہر شخص کو اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خواجہ صاحب نے ان دقتوں کا بڑی بہادری اور استقلال سے مقابلہ کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس مقابلہ میں ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب نے آپ بیتی میں اپنے کیرکٹر کی ایک کمزوری یہ بیان کی ہے کہ وہ واقعات کی ظاہری شکل اور ان کے سطحی نتائج سے جلد متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اسکا ثبوت آپ بیتی میں بھی ملتا ہے۔ اپنی زندگی کے بعض حالات سے جو اصلاحی نتائج خواجہ صاحب نے اخذ کئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو محض سطحی ہیں۔ اور جن کے اخذ کرنے میں فلسفیانہ دقت نظر کی جائے۔ شاعرانہ احساسات اور تخیلات سے کام لیا گیا ہے اس لیئے آپ بیتی کے واقعات پر خواجہ صاحب کے حواشی سب قابل تسلیم نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس اعتبار سے ضرور کارآمد ہیں کہ ان سے خواجہ صاحب کے طریقہ استنباط نتائج پر روشنی پڑتی ہے۔

جدت طرازی و ندرت آفرینی نہ صرف خواجہ صاحب کے تخیل و انشا پردازی کا بلکہ ان کی زندگی کے تقریباً ہر اک شعبہ کا جزو لاینفک بن گئی ہے اور کبھی کبھی خواجہ صاحب اپنی اس قابل رشک قابلیت کو بے محل بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ چنانچہ شاید اسی خیال جدت طرازی نے کہ آپ بیتی کی ترتیب بھی دوسری سوانح عمریوں کی ترتیب سے ممتاز رہے آپ بیتی کے مضامین میں ایک قسم کی الجھن پیدا کر دی ہے۔ شروع میں اپنی زندگی کا مجمل حال لکھا ہے جس میں بہت سی جزئیات بھی آ گئی ہیں۔ جہاں جزئیات کو تفصیلوار بیان

کیا ہے وہاں بہت سی باتیں مجمل رہ گئی ہیں۔ درگاہ حضرت محبوبؒ الٰہی میں سکونت
کی وجہ بیان کرنے کے لیئے جو باب قائم کیا ہے وہ زیادہ تر بیان نسب سے
تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی چند خرابیاں ترتیب میں ہیں جن سے
واقعات کے تاریخی تسلسل میں رخنے پڑتے ہیں۔

مذکورہ بالا چند خامیوں اور لغزشوں کے باوجود خواجہ صاحب نے آپ بیتی
بہت اچھی لکھی ہے۔ اردو ادب میں وہ ایک قیمتی اضافہ ثابت ہوگی۔ مشہور لوگوں
کو اسے پڑھکر اپنی سوانح عمریاں خود لکھنے کا شوق پیدا ہوگا آیندہ نسلیں
اس سے معتدبہ فائدہ حاصل کرینگی اور ایک بڑے شخص کی قابل تقلید زندگی کے
اہم حالات اس کے ذریعہ سے محفوظ ہوجائیں گے ٭

احسان غفرلہٗ

۷۸۶ ھو الکل یا معین

آپ بیتی حسن نظامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احمدک واستغفرک واستعینک یا اللہ

صلاتی وسلامی لعبدک ورسولک یا اللہ

یا اللہ۔ میری مدد کر میں یہ کتاب تیرے ان بندوں کے لئے لکھتا ہوں جنہوں نے تیری محبت۔ اور تیری طلب۔ اور تیرے دین اسلام کی حقانیت و روحانیت حاصل کرنے کو میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اس واسطے میں نے اس کتاب کا نام پیر بھائی رکھا ہے۔ کہ تو ہم سب کا پیر ہے۔ اور ہم آپس میں (تیرے مرید ہونے کے سبب) پیر بھائی ہیں۔ تو مراد ہے۔ ہم مرید ہیں۔ تو حقیقت ہے۔ ہم مجاز ہیں۔ تو جڑ ہے۔ ہم شاخیں ہیں تو نور السموات والارض ہے۔ ہم تیری شعاعیں ہیں۔

ظاہر میں میرا ہاتھ تیرے بندوں کو مرید کرتا ہے اور انکی بیعت لیتا ہے۔ مگر باطن میں تیرا ہی ہاتھ ہمارے ہاتھوں پر ہے اور تو ہی ہمارے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ تو نے قرآن شریف میں فرمایا ہے۔

ید اللہ فوق ایدیھم (خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) پس مجھکو توفیق دے کہ اپنے ہاتھ پر مرید ہونے والوں کو اپنے وجود سے کمتر نہ سمجھوں۔ اپنی ذات کو پیر اور مراد خیال نہ کروں۔ بلکہ تجھکو مراد اور پیر تصور کر کے اپنے مریدوں کو تیرا مرید۔ اور اپنا پیر بھائی جانوں۔ اور ان کی خدمت اس طرح بجا لاؤں جس طرح برابر کا بھائی اپنے دوسرے بھائی کی کرتا ہے۔

یا اللہ تو ہی اپنی قدرت سے میرے دل کو اس کبر و غرور سے پاک رکھ سکتا ہے جو آجکل بعض پیروں پر مسلط ہے اور وہ مریدوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ اور اپنی ہستی کو مریدوں سے اتنا بڑا خیال کرتے ہیں۔ جتنا تو اپنے بندوں سے بڑا ہے۔ الٰہی مجھکو اس گھمنڈ سے بچا۔ اور کسی قسم کی بڑائی اور خود بینی میرے اندر نہ آنے دے۔

اے مولی۔ جس طرح تیرے محبوب اور رسولؐ بندہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم تیرے مرید تھے۔ اور تیرے ہی نام پر تیرے بندوں کو اپنے ہاتھ کے ذریعہ تیرا مرید کرتے تھے۔ اور باوجود اس بزرگی کے کہ ان کی برابر تو نے کسی پیغمبر اور نیک انسان کو مرتبہ بلند نہیں دیا وہ اپنی ذات مبارک کو سب آدمیوں کی اور اپنے سب مریدوں کی برابر تصور فرماتے تھے۔ تصور ہی نہیں ان کے عمل سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ کسی شخص کو جو ان کا مرید ہو جاتا تھا کسی حال میں بھی حقیر اور اپنے سے کمتر نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح مجھکو کہ تیرے ممدوح رسولؐ کا خادم ہوں ایسا دل اور ایسی عبادت مرحمت فرما کہ میرے نفس کو پیری اور بزرگی کا غرور پیدا نہ ہو۔ اور میں تجھکو اپنا پیر اور تیرے بندوں کو پیر بھائی سمجھتا رہا ہوں۔ اور میرا عمل بھی اسی کے موافق رہے۔

یا اللہ۔ اپنی عاجزی کے اظہار اور تیری اطاعت کی طلب کے بعد اب میں تجھ سے ان بندوں کی انکساری و اطاعت کی دعا بھی کرتا ہوں جو میرے ہاتھ پر تیرے مرید ہوئے ہیں جس طرح کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا دل اپنی پیری اور بزرگی پر گھمنڈ نہ کرے۔ اور سب مریدوں کو برابر کا بھائی سمجھے۔ اسی طرح میں مریدوں کے لیئے بھی تجھ سے مانگتا ہوں کہ ان کو بھی اطاعت و ادب کی توفیق دے اور ان کو یورپ کے ان نافرمان بندوں کی طرح نہ بنا جو اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کا حکم نہیں مانتے۔ اور تیرے بنائے ہوئے قواعد خسروی و بزرگی کو توڑ توڑ کر اپنی مطمئن زندگی کا شیرازہ پراگندہ کر رہے ہیں۔

الٰہی میرے مریدوں کو ویسی ہی اطاعت و حکم برداری سکھا جیسی تو نے اپنے رسولؐ

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مریدوں (صحابہ کرامؓ) کو سکھائی تھی۔ کہ وہ رسولؐ کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرتے تھے۔ اور رسولؐ کے حکم کے سامنے اپنی عقلوں اور اپنی تمام خواہشوں کو دبا دیتے تھے۔ رسولؐ کی بات کو سب باتوں سے افضل جانتے تھے اور رسولؐ کی خوشی کو سب مرضیوں سے اعلیٰ دیکھتے تھے ان کو یقین تھا کہ رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ قرآن شریف نے بھی ایسا ہی ارشاد فرمایا تھا۔ اسی لیئے وہ اطاعت رسولؐ پر اپنی جانوں۔ اپنے مالوں اور اپنی عزتوں کو قربان کر دیتے تھے۔

خدایا یہ تیرے ہی فضل سے تھا کہ تیرے رسولؐ غریبوں اور مسکینوں کو برابر کا بھائی سمجھتے تھے۔ اور اپنی زندگی غریبانہ بسر کرنی پسند فرماتے تھے۔ اور اپنی بڑائی و برتری کا کوئی برتاؤ مریدوں سے نہ کرتے تھے اور وہ مرید بھی (صحابہؓ) ان کی برتری و بزرگی کے سامنے دل و جان سے جھکے رہتے تھے۔

ایسا ہی یا اللہ ان لوگوں کو بنا دے جنہوں نے میرے ہاتھ پر تیری بیعت کی ہے۔ کہ وہ بھی میرے احکام کو (اگر وہ تیرے احکام کے خلاف نہ ہوں) تسلیم کریں اور میرے ادب کو (جو درحقیقت تیرے حکم کا ادب ہے) ہر حال میں ملحوظ رکھیں۔ کیونکہ اسکے بغیر انکی دینی و دنیاوی فلاح ممکن نہیں ہے اور اطاعت ہی ان کے طرز عمل کی بہترین رہنما ہو کر ان کو ہر ادمند کر سکتی ہے جیسا کہ مجھ سے پہلے اطاعت ہی نے تیرے بندوں کو ہرادمند دونوں جہان میں کیا تھا۔

یا اللہ اس دعا کو قبول کر۔ آمین۔ اور میرے ارادہ اور نیت کو صلاحیت دے کہ اب میں وہ بیان کروں جو تیرے میرے مرید بندوں اور میرے پیر بھائیوں کو دین دنیا میں مفید ہو۔ آمین ؛

وجہ تسمیہ کتاب ہذا | ایک عرصہ ہوا میں نے آپ بیتی حسن نظامی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ مگر پھر اسکو ترک کر دیا۔ کیونکہ اسمیں مجکو خود نمائی

کی بو آئی - اب خیال آیا کہ پیر بھائیوں کے تجربہ کے لیئے اپنے سب نیک و بد حالات مرتب کر دینے مناسب ہیں۔ کہ ا نہیں ان کو میری زندگی کے تاریک حالات بھی معلوم ہو جائیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی کسی مخفی بات کو پردہ میں نہ رکھوں - اور اپنے ان کاموں کو بھی لکھدوں - جو لوگوں کی نظر میں اچھے ہیں - اور ان کو بھی بیان کر دوں - جو عیب - گناہ - اور خلاف آدمیت ہیں -

دوسرا آدمی میرے حالات لکھیگا تو چن چن کر خوبیاں بیان کرے گا - اور عیبوں کو چھپائے گا - اور ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں کو دھوکا نہ دیا جائے - انسان کی جو اصلی حالت ہو وہی لکھی جائے تاکہ سب اچھی بری باتیں معلوم کر کے دوسرے لوگ اس شخص کی نسبت صحیح رائے قائم کر سکیں -

اور میرے صحیح حالات کا شائع ہونا تو اس واسطے بھی بہت ضروری ہے کہ میں مرید کرتا ہوں - اور ہزاروں آدمی ایسے میرے مرید ہوتے ہیں جنہوں نے مجکو نہیں دیکھا خط کے ذریعہ مرید ہو جاتے ہیں یا لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ میری تحریریں دیکھ کر حسن عقیدت رکھتے ہیں - تو مرید ہوتے وقت ان کو یہ غور کر لینے میں آسانی ہو گی کہ ایسا آدمی پیر بنانے کے قابل بھی ہے یا نہیں +

حسن نظامی کا مختصر سراپا

میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی - والد کا نام حافظ سید عاشق علیؒ والدین زندہ نہیں ہیں (میں بارہ سال کا تھا جب ان کا انتقال ہو گیا) میری قومیت سید ہے، پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ پرانی دہلی ہے - اور وہیں آج کل اقامت ہے - معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے - تعلیم عربی فارسی اردو - عمر ۴۱ سال حلیہ یہ ہے - بہت لمبا قد - کم قدر دبلا کہ سوائے ہڈیوں اور کھال کے گوشت کا نام نہیں - رنگ گورا - چہرہ کتابی آنکھیں سفید و سیاہ اور بڑی بڑی - دونوں بھوؤں کے وسط میں ہلکا سا ایک سرخ نشان جسکو

بچپن سے آجتک پیشین گوئیاں کرنے والوں نے خوش نصیبی کی علامت بیان کیا) پیشانی چوڑی۔ ناک سیدھی۔ رخسارے نہ بہت پچکے ہوئے نہ گوشت سے بھرے ہوئے۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ دہانہ بڑا۔ دانت اب تک سلامت۔ ڈاڑھی گھنی اور ابھری ہوئی۔ سر کے بال کمر تک جنہیں بل ہیں۔ یعنی گھونگر والے (پیدا ہو کر محرم ۱۳۳۲ھ کو بال کٹوا دیئے) سینہ بہت چھوٹا جیسا کہ بارہ سال کے بچہ کا ہوتا ہے۔ سینہ کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی کہ ایک ایک ہڈی گن لو۔ ان پر گوشت بالکل نہیں۔ گردن بہت پتلی اور خمیدہ (جو بچپن میں بہت لمبی اور بہت سیدھی تھی) گردن سے ناف تک کا حصہ بہت لمبا اور یہی وجہ ہے کہ کمر چلنے میں ذرا جھکی رہتی ہے۔ کان درمیانی۔ ٹانگیں لمبی۔ پاؤں درمیانے سر لمبوترا۔ اور بڑا۔

آواز بہت بڑی۔ اور ذرا اگر جدار۔ (جو لحن کا شیریں نہیں رکھتی اگر گانے کی کوشش ہو تو بہت بھدی اور مکروہ معلوم ہوگی) بال بالکل سیاہ۔ جسم کے کسی عضو میں کمزوری نہیں ہے سوائے جگر اور معدہ کے کہ دماغی کام کرنے سے وہ عموماً خراب رہتے ہیں دماغ میں ابتک شدید سے شدید محنت کی برداشت ہے۔ اور رات دن میں بارہ گھنٹہ مسلسل کام کر سکتا ہے۔

زبان میں پہلے بہت لکنت تھی۔ اب بھی کبھی کبھی بولنے میں گرفت ہوتی ہے۔ حافظہ درست نہیں ہے۔ گفتگو میں اس وجہ سے سلسلہ کلام قائم نہیں رہتا۔

ڈاڑھی صرف ایک دفعہ منڈائی تھی۔ پھر کتروانے لگا۔ اب پوری ہے سالہا سال سے۔

شادیاں دو ہوئیں۔ پہلی بیوی سے چار بچے ہوئے۔ ابن حسن نظامی۔ حسن بصری۔ حور بانو۔ نور بانو۔ ان بیوی کا انتقال ہو گیا اور سوائے حور بانو کے تینوں بچے بھی مر گئے۔ سابقہ اہلیہ کے انتقال کے سات برس بعد دوسرا عقد کیا۔ ان سے ایک لڑکا حسین نظامی ہے جو اسوقت ڈھائی سال کا ہے۔ اور دوسرا لڑکا علی ہلال ۲ مہینہ کا ہے۔

بیعت | میں گیارہ سال کی عمر میں اپنے مرحوم والد کے ہمراہ سب سے پہلے تونسہ شریف

ضلع ڈیرہ غازیخان صوبہ سرحد کی گیا تھا۔ اور حضرت شاہ اللہ بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر حسب ہدایت والد بیعت کی تھی (جن کے مرید میرے والد اور تمام خاندان والے مرید تھے) پھر والد کے انتقال کے بعد اپنے برادر مرحوم سید حسن علی شاہ کے ہمراہ سولہ برس کی عمر میں حضرت خواجہ غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین چاچڑاں شریف علاقہ ریاست بہاولپور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بھائی کے کہنے سے ان سے بیعت کی (یہ دونوں بیعتیں اپنے ارادہ اور اپنے خیال سے نہیں کیونکہ اسوقت اتنی عقل نہ رکھتا تھا) اس کے بعد درگاہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ بمقام پاکپتن شریف ضلع منٹگمری حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ صاحب سے باشارہ روح حضرت بابا صاحب (جن سے عقیدت ذاتی خوب سوچ سمجھ کر بیعت کی۔ اسوقت میری عمر ۲۴ سال کی تھی۔ اور میں نے تعلیم و مطالعہ کے ذریعے معلومات تصوف کا کچھ ذخیرہ مہیا کر لیا تھا۔ یہ آخری بیعت حضرت خواجہ اللہ بخش اور حضرت خواجہ غلام فرید کے وصال کے بعد ہوئی تھی)

دست بدست مرید ہوا تھا۔ مرید ہونے کے بعد دینی ترقی تو فوراً شروع ہو گئی۔ اور دنیاوی حالت میں اتنا زوال ہوا کہ فاقہ کشی کرتا رہا۔ معیشت کا اطمینان ۱۹۱۸ء سے ہوا۔ جسکو گیارہ سال ہوئے۔ اس کے بعد دنیاوی ترقی بھی برابر عروج کرتی رہی۔

مرید ہونے کی ترغیب خود میرے دل نے دی۔ میں حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کامل اور اپنا پیر تصور کرتا تھا۔ مگر ان کے بقید حیات نہ ہونے کے سبب ایک زندہ ہادی کی ضرورت تھی۔ اس واسطے اکثر استخارہ کیا کرتا تھا کہ کسی رہنما کا پتہ ملے۔ ایک رات حضرت محبوب الٰہی کو خواب میں دیکھا کہ حضور دریافت فرماتے ہیں کس کے مرید ہو۔ عرض کیا میں خود آپ سے پوچھتا ہوں کہ کس کا مرید ہونا چاہئے۔ فرمایا اپنے آپ کو دیکھو۔

میں نے تعبیر لی کہ اصلاح نفس کا اشارہ ہے۔ جسکی تعمیل میں میں نے مدتوں کتابیں

دیکھ دیکھ کر مجاہدے کئے۔ اس کے بعد خیال آیا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے میرے نسب کا اشارہ نہ کیا ہو کہ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے نسب میں ہوں۔ اپنے آپ کو دیکھنا گویا خود حضرت کے طرز عمل کو دیکھنا ہے۔ اس واسطے ارادہ ہوا کہ جس طرح حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے پیر حضرت بابا گنج شکرؒ کی خدمت میں دہلی سے پاکپٹن شریف تک پیدل جایا کرتے تھے میں بھی پیدل جاؤں۔ مگر اتنی ہمت نہ کر سکا تاہم منٹگمری آیا وہاں سے پاکپٹن تک پیدل گیا۔ جو غالباً بارہ کوس کا فاصلہ ہے اور ریگستانی راستہ ہے۔

یہ سفر بہت بے سروسامانی کا تھا۔ نہ کوئی آدمی ساتھ تھا نہ پیسہ جیب میں تھا نہ روٹی۔ بھوکا پیاسا۔ ایک شوق اور لطف میں روانہ ہو گیا تھا۔ بارہ بجے دن کو دریا کے کنارے پہنچا۔ کشتی موجود نہ تھی۔ پیدل چلنے کی عادت نہ تھی راستہ صاف نہ تھا۔ گرمی کی شدت اور دھوپ کی تیزی سے حواس گم تھے۔ کنارہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ بھوک نے اتنا بے حال کیا کہ وہیں نیم غشی کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اتنے میں کوئی درویش مسافر آئے ان کے پاس آدھ سیر کی ایک موٹی روٹی تھی۔ اس میں سے انھوں نے مجھ کو آدھی روٹی دی۔ اور مسکرا کر کہا اسکو کھاؤ۔ پانی پیو۔ تم کو تو روٹی تقسیم کرنی ہے ابھی سے بے ہوش ہو گئے۔ میں نے وہ ٹکڑا کھایا۔ دریا کا پانی پیا۔ کشتی آگئی۔ اس میں سوار ہو کر پار گئے۔ اور شام کو پاکپٹن شریف پہنچ گئے۔

رات کو میں نے حضور بابا صاحب کے مزار پر عرض کیا کہ طلب شیخ میں حاضر ہوا ہوں۔ صبح کو خود بخود حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کی طرف دل مائل ہوا اور میں نے اسی وقت ان کے پاس حاضر ہو کر بیعت کر لی۔

ذکر نسب

حسن نظامی کے جد اعلیٰ حضرت مولانا سید بدر الدین اسحاقؒ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے داماد تھے۔

حضرت مولانائے موصوف دہلی میں مقیم تھے۔ آپ نے تحصیل علوم اسی شہر میں کی تھی۔ دہلی کے شہرۂ آفاق دانشمندوں اور ممتاز فاضلوں میں اول درجہ پر مانے جاتے تھے۔ ایک رسالہ بھی

حضرت مولانا کو کچھ شبہات واقع ہو گئے تھے۔ جب دہلی میں کوئی ایسا عالم نہ ملا جس سے وہ شکوک وشبہات رفع ہوسکتے تو آپ نے بخارے کا قصد کیا جو ان دونوں علم و فضل کا مرکز تھا۔ جب دہلی سے روانہ ہوئے تو اثنائے راہ میں قصبہ اجودھن بھی آیا۔ جسکو آج کل پاکپتن شریف کہا جاتا ہے۔ یہاں اس زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے تھے جنکی بزرگی کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ حضرت مولانا جب حضرت گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجلس میں بیٹھے تو حضرت بابا گنج شکرؓ نے زبان مبارک سے برسبیل حکایات و تمثیلات بغیر سوال کئے ان تمام شکوک و شبہات کا حل بیان کرنا شروع کیا جنمیں آپ کی طبیعت الجھی ہوئی تھی۔ حضرت مولانا کو بہت تعجب ہوا کہ جن مشکل اور ادق مسائل کے لیے میں بخارے کو جاتا تھا وہ ان درویش نے باتوں باتوں میں حل کر دیئے۔ اور ایسے آسان اور سیدھے سادے پیرایہ میں کہ پھر کسی سوال کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اسلیئے حضرت مولانا نے حضرت بابا صاحب سے اسیوقت بیعت کر لی۔ اور قیام دہلی ترک کر کے وہیں پاکپتن میں رہنے لگے۔ (اب مزار بھی وہیں ہے) ۔

حضرت بابا صاحب نے بھی ان کے کمالات علمی اور شرافت نسبی کا خیال کر کے اپنی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہ کا عقد حضرت مولانا سے کر دیا اور اپنے مکان کے قریب رہنے کو جگہ دی۔

جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ شروع شروع میں بغرض بیعت پاکپتن شریف حاضر ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کی نو عمری تھی۔ حضرت بابا صاحبؓ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت مولانا سید بدر الدین اسحٰقؒ کے پاس ٹھہرایا۔ کہ دہلی والے مہمان کے دہلی والے ہی میزبان بنیں، اور مدارات کا حق ادا ہو۔

فوائد الفواد اور سیر الاولیاء وغیرہ میں تذکرہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے خود فرمایا کہ حضرت مولانا بدر الدین اسحٰقؒ نے میری روحانی تعلیم و تربیت میں خاص حصہ لیا۔ اور حضرت

باباصاحب کے آداب مجلسی اور لوازمات شیخوخیت سکھلائے۔

حالات حضرت مولانا بدرالدین اسحٰق حسب بیان سیر الاولیاء و فوائد الفواد بڑے عابد زاہد اور صاحب کرامات تھے سوز و درد و باطن کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی تھیں۔ اور جہاں خدا رسول کا ذکر سنتے بے اختیار زار و قطار رونے لگتے تھے۔

تصانیف حضرت مولانا کی متعدد علمی تصانیف تھیں۔ جن میں اسرار الاولیا، حضرت باباصاحب کا ملفوظ اب بھی موجود ہے۔ اور صرف یانحو کا ایک رسالہ بھی کہیں کہیں قلمی صورت میں پایا جاتا ہے۔

حضرت باباصاحب کی صاحبزادی سے حضرت مولانا بدرالدین اسحٰق کے دو فرزند پیدا ہوئے ایک خواجہ سید محمد امام دوسرے خواجہ سید موسیٰ۔

جب حضرت باباصاحب اور حضرت مولانا سید بدرالدین اسحٰق کا انتقال ہوگیا۔ اور حضرت مولانا کی اہلیہ دو یتیم بچوں کے ساتھ کچھ تکلیف میں سی گئیں اور حضرت محبوب الٰہیؒ کو اسکی خبر پہنچی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ کیونکہ ایک تو اپنے پیر کی صاحبزادی ہونے کی حیثیت سے آپکو بی بی فاطمہ سے ہمدردی تھی۔ دوسرے اپنے روحانی معلم و مربی حضرت مولانا کی اہلیہ ہونے کے سبب آپکو ان بی بی صاحبہ کا خیال تھا۔

سیر الاولیاء میں مذکور ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت سید محمد کرمانی صاحب کو پاکپٹن بھیجکر ان بی بی صاحبہ کو دونو یتیم بچوں سمیت دہلی میں بلالیا، اور اپنے پاس نہایت ادب و دلجوئی سے رکھا۔ حسن نظامی کے جد اعلیٰ کے دفعائل ہی حضرت محبوب الٰہی کے سجادہ نشین تھے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ان بچوں کو بطور متبنے اور فرزند معنوی کے پرورش کیا۔ اور خاص نگرانی کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کرائی اور جب بڑے بچے سید محمد صاحب کی عمر بڑی ہوگئی تو ان کو اپنی امامت عطا فرمائی۔ یعنی حضرت محبوب الٰہیؒ کی نماز میں حضرت سید محمد امام بنائے جاتے تھے اسوقت سے ان کے نام کے ساتھ لفظ امام شامل ہوگیا۔ اور لوگ انکو خواجہ سید محمد امام کہنے لگے۔

سیر الاولیاء میں جو سب سے مستند تذکرہ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے وقت کی لکھی ہوئی کتاب ہے لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت خواجہ سید محمد امام کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ قطع نظر قرابت کے ان کو ہر وقت اپنی خلوت و جلوت کی صحبت میں شرکت کا موقع عطا فرماتے تھے یہاں تک کہ خلوت حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت خواجہ سید محمد امام کی عظمت و بزرگی میں تھا کہ اپنے سامنے خواجہ سید محمد امام سے لوگوں کو مرید ہونے کی اجازت دیتے تھے اور خواجہ سید محمد امام کو اپنے روبرو دوسروں کو مرید کرنے کی فہمائش ہوتی تھی۔ بہت بڑی بات تھی کہ حضرت محبوب الٰہیؒ خود اپنی موجودگی میں کہ شیخ کامل تھے ایک نوعمر شخص کی بیعت کا دوسروں کو حکم دیتے تھے۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے خواجہ سید محمد کی بیعت دوسروں سے کرا لیتے تھے۔ یہ بیان بھی سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ سید محمد امام حضرت محبوب الٰہیؒ کا عطا کردہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔

صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہیؒ کی مجلس میں حضرت خواجہ سید محمد امام سے کوئی شخص اونچی جگہ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نیز حضرت محبوب الٰہیؒ کے اقرباء یاران خلفاء وغیرہ میں کسی کو یہ درجہ حاصل نہ تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی موجودگی میں خود میر مجلس یا صاحب سماع بنے سوائے حضرت خواجہ سید محمد امام کے۔ کہ ان کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ امتیاز مرحمت فرمایا تھا کہ حضرت کے سامنے میر مجلس اور صاحب سماع بنتے تھے۔ حضرت خواجہ سید محمد امام کے یہ پانچ اوصاف کہ اول یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے پیر کے حقیقی نواسہ تھے۔ دوسرے حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلم روحانی کے فرزند تھے۔ تیسرے حضرت محبوب الٰہیؒ کے امام تھے۔ چوتھے یہ کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے باوجود اس کے کہ ان کے اقربا اور خلفا میں بڑے بڑے اکابر موجود تھے مگر انھوں نے خواجہ سید محمد امام کی جگہ مجلس میں سب سے بالاتر رکھی تھی۔ اور اپنے سامنے ان کی بیعت لوگوں سے کراتے تھے اور پانچویں یہ کہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی موجودگی میں ان کو میر مجلس اور صاحب سماع قرار دیتے تھے۔

ایسے ہیں کہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ سید محمد امام ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کے نسبی روحانی اور ہر حیثیت سے سجادہ نشین اور وارث تھے۔ کیونکہ حضرت محبوب الٰہی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے ساری عمر نکاح ہی نہیں کیا تھا۔ اور حضرت خواجہ سید محمد امام ہی ان کے فرزند معنوی اور فرزند حقیقی کے طور پر مانے جاتے تھے۔ اور وہی لفظاً معنًا اور مجازاً و حقیقتہً اور نقلی اعتبار سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے جانشین تھے۔

حسن نظامی انہی حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد میں ہے۔ اور یہی وجہ اسکی اس درگاہ میں سکونت کی ہے۔ کہ چھ سو برس سے اس کے بزرگ نسلاً بعد نسل یہاں مقیم رہے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ مقیم رہیں گے۔

خواہرزادگی کا لفظ جو حسن نظامی کے نام کے ساتھ ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد کی قرابت حضرت محبوب الٰہیؒ کی خواہرزاد اولاد سے ہمیشہ رہی اور اب بھی ہوتی ہے۔

ان مستند اور معتبر حالات کی بنا پر درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی سجادگی کا حق اولاد حضرت خواجہ سید محمد امام کا ہے۔ اور قیامت تک رہے گا۔ خدا کرے کہ یہ اولاد اصلی معنوں میں فرائض سجادگی کو ادا کرنے کے قابل ہو اور اپنے جد کی طرح حقیقی فرزند حضرت محبوب الٰہی کی بنجائیں۔

یہاں مجھے اپنی آنے والی نسل سے یہ خطاب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسب کے اس فخر اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی مقرر کردہ سجادگی اور امتیازات مخصوصی پر گھمنڈ نہ کرے۔ ضرورت عمل کی ہے۔ کہ عمل ہی سے تمہارے دادا حضرت خواجہ سید محمد امام کو یہ درجہ حاصل ہوا تھا جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے کسی خلیفہ کو حاصل ہوا نہ قرابت دار کو۔

حسن نظامی کی ولادت اور زندگی کا حال

تیرہویں صدی کے خاتمے کے قریب ۱۲۹۶ھ ہجری میں ۲ محرم کو جمعرات کے دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا جسکی رو سے آجکل کہ جمادی الاول ۱۳۳۴ھ ہے اس

کی عمر ۴۱ سال کی ہے۔

حسن نظامی نے ہوش سنبھال کر اپنے ایک بڑے بھائی سید حسن علی شاہ کو دیکھا (جو سات برس ہوئے رحلت کر گئے) اور ایک بہن حسن بانو کو (یہ بھی تیس برس ہوئے انتقال کر گئیں)

تعلیم

حسن نظامی نے پہلے ناظرہ قرآن شریف پڑھا، پھر فارسی کی چند معمولی کتابیں۔ اس کے بعد عربی صرف و نحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی، بڑی عمر میں کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا)۔

اس کے استاد اول دن سے حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم ساکن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھے جو دہلی کے شاہی خاندان کی ملازمت کے سبب یہاں درگاہ شریف کے قریب ساری عمر مقیم رہے۔ اور یہیں انکا انتقال ہوا اور اسی جگہ ان کا مزار بنا۔

حسن نظامی شرح تہذیب اور کنز الدقائق پڑھتا تھا بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اس کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ اور اسکی پرورش اسکے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی۔ اور اسکی عربی تعلیم کے جاری رکھنے میں مددگار رہے۔

جلالین اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے اور سنن ابوداؤد و ترمذی شروع کرنے کے بعد حسن نظامی شہر دہلی میں چلا گیا۔ اور وہاں اس نے مولوی عنایت علی صاحب مرحوم اور مولوی عبدالعلی صاحب محدث اور مولوی حکیم الہ دین صاحب پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن صاحب ساکن کاندھلہ سے کچھ دنوں مختلف کتب کی تعلیم حاصل کی اور درگاہ کے قیام میں بعد وفات مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا میاں محمد صاحب سے بھی مدتوں سبق لیے۔

اس کے بعد جناب مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم خلف جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ساکن کاندھلہ جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کے شاگرد رشید تھے مجھکو گنگوہ لے گئے۔ اور وہاں میں نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔

شادی

گنگوہ سے واپسی کے بعد حسن نظامی کا نکاح اس کے مرحوم چچا سید معشوق علی صاحب کی لڑکی حبیب بانو سے ہوا۔ اور اس نکاح کے بعد متواتر کئی سال نہایت عسرت و پریشان حالی میں گزرے۔ یہ ایام اخباری مضامین لکھنے مطالعہ کتب قومی مجالس کی شرکت۔ اور مختلف وسیلے حصول تجارتی جستجو میں بسر ہوئے۔

اگرچہ زندگی کا یہ دور معیشت کے لحاظ سے مصیبت کا زمانہ تھا تاہم اطاعت شعار بیوی اور دوست نواز احباب کی اعانت اور ذاتی محنت و تلاش کے سبب حسن نظامی نے اہل درگاہ کے پیشہ پیرزادگی کو ترک کر دیا تھا۔ اگر بیوی بے صبر ہوتیں۔ اور احباب اس کی ضرورتوں کی کفالت نہ کرتے۔ (جن میں خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور علیگڑھ اور مرحوم راجہ نوشاد علی خان تعلقہ دار لکھنؤ اور شیخ غلام محمد صاحب مرحوم مالک اخبار وکیل امرتسر اور سب سے زیادہ منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی۔ اور نواب خواجہ غلام نصیر الدین خان صاحب رئیس شیخ پورہ ضلع میرٹھ۔ اور شہزادہ میرزا امیر الملک صاحب دہلوی تھے) تو شاید بہت دشواریاں استقلال میں پیش آتیں۔

اس دور میں حسن نظامی نے اہل درگاہ کے مروجہ طرز معاش کو ترک کر دیا تھا اور کسی ظاہری سہارے کے نہ ہونے کے سبب روٹی کا میسر آنا محال نظر آتا تھا۔

خدا مغفرت کرے حسن نظامی کی سابقہ زوجہ حبیب بانو کو جنہوں نے اس تلخ اور بھوک میں ستانے والے وقت میں اپنے شوہر کا نہایت رازداری کے ساتھ حق رفاقت ادا کیا۔

اسی زمانہ کے آخر میں خدا تعالیٰ نے غیبی مدد بھیجی اور ایک یورپین جنرل ڈکسن سے ملاقات ہوئی جو اسلام کے شیدا اور تصوف کے شیفتہ تھے۔ اور ہر سال لندن سے دہلی آتے تھے جنرل ڈکسن کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے حسن نظامی کی وسعت رزق کا فتح باب فرمایا۔ جنرل موصوف ہر سال کے شروع میں اتنی کثیر رقم دیتے تھے جس سے تمام برس کے اخراجات فراغت سے ہو جاتے تھے۔ اور حسن نظامی کو مشاغل علمی میں مصارف خانگی کا فکر و تردد نہ کرنا پڑتا تھا

جنرل ڈکسن پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلامی اور روحانی تعلق میں حسن نظامی کو اپنا پیر سمجھا تھا۔ اور حسن نظامی کو بھی پہلا تجربہ ایک انگریز کی اخلاص شعاری اور بے غرض دوست نوازی کا ہوا تھا۔ وہ وقت بھی عجیب تھا خلقت کہتی تھی کہ یہ انگریز کوئی جاسوس ہے جو بھیس بدل کر دہلی آکر رہتا ہے۔ اور گھنٹوں حسن نظامی کے حجرہ میں تخلیہ رکھتا ہے۔ کوئی کہتا حسن نظامی کرسٹان ہو گیا۔ جو انگریز کے ساتھ کھاتا پیتا ہے کوئی کہتا۔ انگریزوں کی قوم بڑی چالاک ہے خبر نہیں یہ انگریز کس منصوبہ کو لے کر آیا ہے۔ اور کیوں حجرہ کے اندر کواڑ بند کر کے چپکے چپکے باتیں کیا کرتا ہے۔ مگر حسن نظامی کہہ سکتا ہے کہ جنرل ڈکسن کسی سیاسی غرض کے آدمی نہ تھے۔ ان کو اسلام اور مسلمین کے ساتھ ایک عشق تھا۔ وہ صوفیوں کی روش کے عاشق زار تھے۔ ان کو روحانی ریاضتوں اور سلوک تصوف کے اسرار معلوم کرنے کا شوق تھا۔ وہ اسلامی دنیا کے بہت بڑے سیاح تھے۔ سوڈان وٹرانسوال کے محاربات میں انہوں نے بڑے بڑے کام کئے تھے۔ مصر کے مفتی محمد عبدہٗ سے انکی دوستی رہ چکی تھی، ہندوستان میں موجودہ مہاراجہ گوالیار و بیکانیر و نواب صاحب رام پور ان کے دوست تھے۔ ان کی عمر ساٹھ سے زیادہ تھی وہ بڑے تجربہ کار اور جہاندیدہ انگریز تھے۔ اردو بولتے تھے۔ اور اردو لکھ پڑھ بھی سکتے تھے۔

جنرل ڈکسن جنگ یورپ کے بعد پھر ہندوستان نہیں آئے نہ ان کا خط آیا تاہم سنا ہے کہ وہ زندہ ہیں (خدا ان کو زندہ رکھے) وہ انگریزی خصلت کا نمونہ تھے اگر ایسے ملنسار اور محبت شعار انگریز ہندوستان کی حکومت پر مقرر ہو اکریں تو موجودہ باہمی نفرت حاکم محکوم میں کبھی پیدا نہ ہو۔ حسن نظامی ان کا ذکر اس واسطے لکھتا ہے کہ ان کے احسانات کو زندگی حاصل ہو اور انکی یاد حسن نظامی کے ذکر میں ہمیشہ سلامت رہے کہ وہ دور دشوار کے یقینی فرشتہ تھے جنکو خدا نے حسن نظامی کی مدد کے لیے بھیجا تھا،

زمانہ مخت زمانہ میں ایک روسی بھی حسن نظامی کا مرید ہوا تھا۔ اور حسن نظامی نے اس کو

خرقہ دیا تھا) اپنے ملک میں جاکر اس نے لکھا کہ مجکو اپنے پاس فقیر بناکر رکھو اور تصوف کی تعلیم دو۔ مگر جنگ یورپ کے سبب مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے مجکو اجازت نہ دی اور میں اس روسی کو دہلی نہ بلاسکا۔

قصہ مختصر یہ چند سال ایسے تھے جن میں حسن نظامی نے اخباروں میں مضامین لکھے تمام قومی جلسوں کی سیر دیکھی۔ ترقی سلوک کے لیئے مجاہدات کئے اور اپنے ایک مقصود اور طرز عمل قایم کرنے پر مسلسل غور و خوض کی۔

آخر ۱۹۰۸ء میں سید محمد ارتضیٰ صاحب عرف محمد الواحدی نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور حلقہ نظام المشائخ اور رسالہ نظام المشائخ کی بنیاد انکی شرکت و امداد سے ڈالی گئی یہ لکھنا رہ گیا کہ مذکورہ ایام میں حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ صاحب نے حسن نظامی کو مرید کرنے کی اجازت دیدی تھی اور ریاست الور میں مولوی محمد دراز نظامی درگاہی شاہ کی معیت میں ایک معقول جماعت نے حسن نظامی کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ یہی نہیں بلکہ خطوط کے ذریعہ سے لگاتار اور جوق جوق خلقت بیعت ہو رہی تھی۔

حلقہ نظام المشائخ قائم کرنے کے بعد مشکلات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ گھر کے مخالف اسکو بچوں کا کھیل کہتے تھے۔ اور مذاق اڑاتے تھے۔ اور بات بھی سچی تھی کہ ابتداء میں حلقہ کے ممبر اور کام کرنے والے عموماً نوعمر لوگ تھے۔

واحدی صاحب۔ مرزا یعقوب بیگ صاحب ناجی ایم۔ اے سید وحید الرحمٰن صاحب عرفانی بی۔ اے۔ ضیاء الدین احمد صاحب برنی بی۔ اے۔ علاؤ الدین صاحب نصیری پیرزادہ درگاہ حضرت چراغ دہلی صاحب۔ قاضی لطیف الدین صاحب پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب۔ وغیرہ نوخیز لوگ حلقہ کے ابتدائی شرکاء تھے۔ جن پر آزادانہ نکتہ چینی کی جاتی تھی۔

اسی زمانہ میں حسن نظامی پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسکی صاحبزادی حبیب بانو نے انتقال کیا۔ اس کے لڑکے مرگئے اور اس کے خلاف درگاہ کی برادری نے ایک باضابطہ یورش

برپا کی۔ روزانہ درگاہ میں آنے والوں کے سامنے حسن نظامی کی برائیاں بیان کی جاتی تھیں اور طرح طرح کے غلط بہتان اس کے ذمہ لگائے جاتے تھے۔ اس شورش نے یہاں تک ترقی کی کہ ایک دفعہ عرس کے موقع پر جبکہ ختم کی شرکت کے لیے کئی ہزار آدمی مزار شریف کے سامنے جمع تھے ایک قرابتی بھائی صاحب نے حسن نظامی کے خلاف نہایت دل آزار لکچر دیا۔ اور جو الزامات انہیں لگائے گئے ان کی تائید و تصدیق خاص حسن نظامی کے قریبی کنبہ داروں نے کی۔ جو اس کے جد شریک بھائی تھے۔

ایک طرف تو یہ کیا۔ اور دوسری طرف پولس میں رپورٹ کی کہ حسن نظامی درگاہ میں فساد کرانے والا ہے۔ اس رپورٹ کی بنا پر پولس نے حسن نظامی اور اسکی محدود جماعت کا محاصرہ کر لیا۔ عین اسی ہنگامہ کے وقت ایک دوسرے قرابت دار نے حسن نظامی کے سامنے آکر ایسی سخت درشت گفتگو کی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حرب و ضرب کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔

یہ بہت نازک وقت تھا۔ حسن نظامی کے دل کی نظریں خدا کی ذات کو دیکھ رہی تھیں کہ میرا کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور بے خطا یہ یورش مجھ پر کی جاتی ہے۔ اور کوئی حمایتی دکھائی نہیں دیتا۔

اسی اثنا میں جناب میر جالب صاحب (موجودہ ایڈیٹر اخبار ہمدم) تشریف لائے۔ اور انھوں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو میں ان لکچرار صاحب کی تقریر کا تقریر میں جواب دوں۔ حسن نظامی نے کہا کہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خدا جزائے خیر دے۔ ہمکو صبر کرنا چاہیئے مگر حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی نے (جو آجکل دہلی میں مطب کرتے ہیں) نہ مانا گیا اور انھوں نے وہیں مجمع لکچر میں جا کر مخالفوں کو جواب دیئے حسن نظامی کو اطلاع ہوئی تو اس نے حکیم صاحب کو واپس بلا لیا۔ اور کہا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے "کشندہ کشندہ بود" جو برداشت کر لیتا ہے وہ مار ڈالتا ہے۔ یہ وقت ضبط اور برداشت کا ہے۔ میں اپنی قوم کا بدخواہ نہیں ہوں۔ خدا اسکو جانتا ہے۔ وہی میری حمایت کرے گا۔ اور ان شرارتوں سے بچائے گا۔ جب میرا کچھ قصور نہیں ہے اور میں صرف یہی چاہتا ہوں کہ بعض خلاف شریعت

مراسم کی اصلاح ہو۔ اور طوائفیں مزار کے سامنے رقص نہ کریں۔ تو اس مخالفت کو وہی دور کرادے گا جسکے حکم کی اطاعت سے مجھ پر یہ حملہ کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد ایک محضر تیار کیا گیا جس میں حسن نظامی کو خارج از اسلام اور خارج از مشرب تصوف ثابت کیا گیا۔ اور درگاہ کے حقوق سے بھی اسکو محروم کرنے کی درپردہ سعی کی گئی تھی اس محضر پر تمام خاندان یعنی باشندگان درگاہ شریف نے دستخط کئے تھے۔ صرف ان چند آدمیوں نے اس فتوے سفاکی پر دستخط کرنے سے انکار کیا تھا۔ سید حسن علی شاہ صاحب برادر حقیقی حسن نظامی۔ سید محمد صادق صاحب برادر ماموں زاد۔ موجودہ خسر حسن نظامی سید صمصام الدین صاحب۔ سید واجد علی صاحب مرحوم۔ سید اکبر علی صاحب۔

اس کے بعد مشایخ و علماء رؤسا دہلی سے بھی اسپر دستخط کرائے گئے۔ اور حسن نظامی کو یاد رہے گا کہ اس کے دوست اور روشن خیال بزرگوں نے بھی اسپر دستخط کردیئے۔ مگر حضرت مولانا شاہ ابوالخیر صاحب نقشبندی سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ اور حضرت مولانا محمد عمر صاحب اخوندجی قادری نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔

دہلی میں میرزا حیرت ایک اخباری معاون بھی ان مخالفین کے تھے جو میرے خلاف بہتانات والے آزار مضامین شائع کرتے تھے۔ ان مشکلات کے ساتھ ساتھ بیماری نے بھی حملہ کیا۔ اور حسن نظامی کو نمونیہ ہوگیا۔ اسوقت حکیم محمود علی خان ماہر اور واحدی صاحب اور برادر سید محمد صادق صاحب نے حسن نظامی کی بہت خدمت کی اور شورش کی خبروں کو اس کے کان سے بچائے رکھا۔

بیماری کے بعد حسن نظامی کلکتہ گیا۔ اور لارڈ منٹو وائسرائے ہند تک اسکی رسائی ہوئی اور وائسرائے نے اسکو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا۔ یہ خبریں دہلی میں آئیں تو مخالفین کی آتش حسد بھڑکی۔ اور ان کو اندیشہ ہوا کہ ہم کو درگاہ سے خارج کرنے کو حسن نظامی نے کوئی منصوبہ تیار کیا ہے۔

حکیم حاذق الملک بہادر دہلوی نے حسن نظامی سے بیان کیا کہ درگاہ کے چند بڑے آدمی ان کے پاس گئے۔ اور کہا ہم نے سنا ہے کہ حسن نظامی لاٹ صاحب سے اسلئے ملا ہے کہ ہم سب کو درگاہ سے نکالدے اور خود مالک بن جائے۔ اور آپ اس کے مددگار ہیں۔ حکیم صاحب نے ان لوگوں کو مطمئن کیا۔ اور فرمایا حسن نظامی کی یہ نیت ہرگز نہیں ہے وہ آپ لوگوں کا بدخواہ و دشمن نہیں ہے بلکہ حامی ہے۔ آپ اس خیال کو دل میں نہ آنے دیجئے۔

ایک رشتہ دار صاحب نے مخالفت کو یہاں ختم نہ کیا اور وہ پیران کلیر شریف کے عرس میں گئے۔ اور تمام مشائخ کو مجبور کیا کہ حسن نظامی کے خلاف محضر پر دستخط کریں۔ بعض نے کیۓ بعض نے انکار کیا۔ چنانچہ پانسہ شریف کے سجادہ نشین حضرت غلام جیلانی شاہ صاحب اور حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ صاحب نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔

حسن نظامی کو معلوم ہے کہ سفر بنگالہ کے زمانہ میں جبکہ دہلی میں شدید یورش حسن نظامی کے خلاف تھی۔ واحدی صاحب۔ اور قاضی لطیف الدین صاحب پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب اور منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب برابر ایسی تدابیر میں مصروف رہے جن سے یہ شعلے فرو ہوں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب مخالفین جلسہ مسلم لیگ دہلی کے مہمانوں میں (سابقہ جلسہ لیگ دہلی جو ہز ہائینس آغا خان کی صدارت میں ہوا تھا) حسن نظامی کے خلاف اشتہارات تقسیم کرنے گئے تھے تو غلام نظام الدین قریشی پرمی احمد آبادی (جو اب حسن نظامی کے مخلص مرید ہیں) اور ان کی جماعت نے ان اشتہاریوں پر حملہ کیا اور ان کو مکان سے باہر نکالدیا۔

ضرورت نہ تھی کہ اتنی بڑی رام کہانی خواہ مخواہ یہاں بیان کی جاتی۔ مگر آئندہ نسلوں کی یادداشت خصوصًا اپنے بچوں کی معلومات کے لئے اس کا مختصر سا ذکر مناسب تھا۔ تاکہ وہ اپنے عمل کے وقت مخالفتوں سے گھبرائیں نہیں۔ اور ان کو یاد رہے کہ استقلال اور ہمت ہر مخالفت کو جیت لیتی ہے۔ چنانچہ حسن نظامی کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جو سب سے

زیادہ شدید مخالف تھے (سوائے چند کے) وہ رفتہ رفتہ دوست بن گئے۔ اور ان کے عناد و حسد کی آگ دلوں میں دب گئی۔ گو اس کا بجھنا محال تھا مگر حسن نظامی نے باوجود قدرت حاصل ہونے کے اپنے دشمن سے انتقام کی خواہش نہ کی۔ بلکہ حتی المقدور ان کے ساتھ احسان کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

درگاہ والوں کو یہ خیال تھا کہ حسن نظامی کی شہرت و ترقی ہماری معاش کے لیے مضر ہو گی۔ اور حسن نظامی کے سامنے ہم کو کوئی نہ پوچھے گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھ لیا کہ حسن نظامی ہماری آمدنی سے کچھ غرض نہیں رکھتا۔ اور اس کی روزی تجارت پر منحصر ہے تو رفتہ رفتہ خاموش ہوتے گئے۔

عجیب واقعہ

مگر بے موقع نہ ہو گا اگر ایک عجیب واقعہ کا ذکر یہاں کیا جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک صاحب حسن نظامی اور حلقۃ المشائخ کے بڑے مخالفین میں تھے۔ اور کوئی اہم کام ان کے مشورہ کے بغیر نہ ہوتا تھا۔ ایک دن وہ دہلی میں (جہاں ان دنوں میرا قیام تھا) منزل کاہ حلقۃ المشائخ کے اندر گئے۔ اور روتے ہوئے آئے اور کہا کہ ان کو حضرت محبوب الٰہی نے خواب میں بشارت دی ہے کہ حسن نظامی میرا ہے۔ اس کی مخالفت نہ کرو (مفہوم یہ تھا۔ الفاظ یہ نہ تھے جو اس وقت یاد نہیں) اس واسطے میں تمہارے حلقہ کا ممبر بنتا ہوں۔ اور آئندہ مخالفت کرنے سے تائب ہوتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے یہ خواب لکھ دیا اور حلقہ کے ممبر بن گئے۔ بلکہ اس خواب کو چھپوا کر تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ مدت کی بات ہے۔ عبارت یاد نہیں رہی۔

مقصود کا تقرر

ان تمام امتحانات و مشکلات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حسن نظامی کے قلب کو ہدایت کی اور اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصود قرار دے لیا۔ اور وہ یہ تھا کہ اسلامی تصوف کو نئے انداز اور جدید طرز میں لکھا جائے۔ کہا جائے۔ برتا جائے۔ چنانچہ اس مقصود کے پیش نظر رکھنے کے ماتحت اس نے اپنا عمل شروع کیا حلقہ نظام المشائخ

کی اغراض اربعہ بھی اسی اصول پر قائم کی گئی تھیں۔ جن میں ایک تصوف کی حفاظت و اشاعت دوسری مشائخ صوفیہ کو مرکز اتحاد پر لانا۔ تیسری عرسوں اور خانقاہوں کی ان مراسم کی اصلاح بھی جو دائرہ شریعت و طریقت سے خارج ہو گئی ہیں۔ چوتھی مشائخ کے سیاسی حقوق کی حفاظت۔

حلقہ کی پہلی غرض حفاظت و اشاعت تصوف پر عمل کرنے کے لیئے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے ایک صوفی پرچہ مولوی نہال الدین احمد صاحب پھلواری نے الاحسان کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو عام فہم نہ ہونے کے سبب بند ہو گیا تھا۔ اور لکھنؤ سے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر بھی ایک کوشش التوفان کے نام سے جاری کر چکے تھے جو مقاصد اصلی کے پیش نظر نہ ہونے کے سبب جاری نہ رہ سکا تھا۔

نظام المشائخ نے وہ کام کیا کہ نہ صرف خود زندہ رہا۔ اور زندہ ہے۔ اور بہت کامیابی اور شان کے ساتھ موجود ہے۔ بلکہ اس نے ایک عام تحریک ملک میں اس قسم کے علم ادب کی پیدا کر دی۔ چنانچہ پنجاب سے رسالہ صوفی و طریقت انوار الصوفیہ پھلواری سے رسالہ معارف۔ میرٹھ سے اسوۂ حسنہ وغیرہ پرچے اس مقصد اہم کی تکمیل کے لیئے جاری ہو گئے جو آج تک سوائے دو ایک کے جاری ہیں۔ یہ اثر پرچوں تک محدود نہ تھا بلکہ متعدد نامہ نگار پیدا ہو گئے۔ جو صرف تصوف کے رنگ میں اسلامی۔ تاریخی اور ادبی مضامین لکھنے لگے۔

خدا کے فضل سے نظام المشائخ کو آج تک کہ گیارہ برس سے زیادہ عرصہ اس کے اجرا کو ہو گیا کسی قسم کی مالی یا قانونی دشواری پیش نہیں آئی۔ اور اسکی اشاعت اکثر بلکہ تمام ماہوار اردو پرچوں سے بڑھی رہی۔ اور بڑھی ہوئی ہے۔

حلقہ کی غرض حفاظت کے ماتحت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔ جہاں آج بے شمار قلمی و نایاب کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔

اصلاح مراسم کی کوششوں میں ایک اصلاح بہت زیادہ کامیاب ہوئی کہ درگاہوں سے بازاری عورتوں کا ناچ گانا بند ہو گیا جسکی بدولت حسن نظامی نے بڑے بڑے مصائب

برداشت کئے تھے۔ حسن نظامی نے بادشاہ دکن میر عثمان علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سے بھی زبانی درخواست کی تھی کہ مملکت دکن کی خانقاہوں میں یہ بدعت بکثرت رائج ہے کہ وہاں فاحشہ عورتیں مزارات کے سامنے ناچتی گاتی ہیں تو اعلیٰ حضرت نے فوراً احکام جاری کرادیے اور اپنی تمام قلمرو میں حکم شدید کے ساتھ اس بدعت کو بند کرادیا۔

باقی اغراض پر حکومت کے چند در چند شبہات کے سبب عمل نہ ہوسکا۔ جو مسلسل چار سال قائم رہے۔ حکومت ہی کے شبہات نہ تھے بلکہ مشائخ بھی اس جدید طریقہ سے مانوس نہ ہوتے تھے اور طرح طرح کی مشکلات حلقہ کے کام میں ڈالتے تھے۔

حکومت کے شکوک کا باعث یہ ہوا کہ حسن نظامی نے ممالک اسلامیہ کا ایک طولانی سفر حلقہ کی اغراض کے ماتحت کیا تھا تاکہ بیرونی مشائخ اور خانقاہوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرے۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۱ء میں ممالک مصر، فلسطین، شام، حجاز کا ایک مفصل دورہ کرکے واپس آیا۔ اور بہت وسیع تجربے ساتھ لایا جو ایسے تھے کہ اگر سلطنت رخنہ انداز نہ ہوتی تو ان سے بہت اچھے اور بڑے فائدے حاصل کئے جاسکتے تھے۔

حکومت کا شبہ بعض ترکوں کی ملاقات اور مصر کی آزاد جماعت کے پیشواؤں سے ملنا جلنا تھا۔ جو زمانہ سفر میں حسن نظامی کے لئے ایک لازمی امر تھا کیونکہ وہ تصوف و اہل تصوف کی نسبت جدید جماعتوں کے خیالات معلوم کرنے چاہتا تھا۔

واپسی سفر کے بعد پولس کی زبردست نگرانی شروع ہوگئی اور جنگ طرابلس و بلقان کے ایام نے اسکو اور بڑھا دیا۔ اور کانپور کا واقعہ تو اس سونے کے لئے سہاگہ ثابت ہوا۔ اور کوئی مرحلہ مشکلات و تکلیفات کا باقی نہ رہا جو حسن نظامی کے جسم، مال اور روح کو نہ پہنچا ہو۔ اس نگرانی نے حلقہ کے ان ماہواری اور ہفتہ وار جلسوں کو بھی بند کرادیا جو نوجوانوں میں ذوق تصوف پیدا کرتے اور بڑھاتے تھے۔ ایک اعتبار سے تو حلقہ کی نمودی زندگی اس آشوب نے بالکل ہی ختم کردی گو حسن نظامی کی تحریروں اور تقریروں نے حلقہ کی روح کو دنیا سے جانے نہ دیا

قصہ مختصر ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۱۹ء تک حسن نظامی کی زندگی۔ مضامین نویسی تصنیف و تالیف کتب اور خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خدا تعالیٰ کی عنایت سے اسکے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں اور عقد ثانی کر لینے کے سبب اسکی خانگی زندگی میں بھی ایک اطمنان اور سکون پیدا ہو گیا۔

۱۹۱۳ء میں حسن نظامی نے نظام المشائخ تمام و کمال واحدی صاحب کے سپرد کر کے میرٹھ سے ایک اخبار توحید جاری کیا جو ۹ مہینے زندہ رہ سکا اور اس قلیل زمانہ میں اسکی ایسی شہرت ہوئی کہ ہندوستان میں کسی ہفتہ وار اُردو اخبار کی نہ ہوئی ہوگی۔ اور ایسی ہی اُسکی اشاعت و مقبولیت کی وسعت تھی۔ آخر حکام سلطنت نے اس کو جبراً ضبط کر لیا اور حسن نظامی کو قیام میرٹھ ترک کر کے دہلی آنا پڑا۔

جنگ یورپ شروع ہونے کے بعد حسن نظامی نے ملک کے تعلیمی۔ مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا اور سیر و سیاحت میں بھی کمی ہو گئی کیونکہ پولس کی زیادتیاں اتنی زیادہ تھیں کہ اس کو کسی جگہ امن اور چین نہ ملتا تھا۔ پولس والے ریل میں ایک ڈاکو یا خوفناک مجرم کی طرح ہر جنکشن پر تفتیش حال کرتے تھے اور آدھی رات پچھلی رات کی نیند بھی ان کی نذر ہوتی تھی کیونکہ اگر ان اوقات میں کوئی جنکشن آتا تھا تو پولس آکر اسکو جگاتی تھی اور پرسش احوال کرتی تھی۔ اس کے علاوہ جس شخص کے ہاں قیام کیا جاتا تھا اُسکا بھی ناک میں دم آجاتا تھا۔ پولس اس کو بھی ستانے سے باز نہ رہتی تھی۔

یہی وہ امتحان کا زمانہ تھا جس میں ہمت و بے ہمتی آزمائی جاتی تھی حسن نظامی کو جن دوستوں اور مریدوں کی جوانمردی پر اعتماد تھا وہ پولس کی یورش سے گھبرا جاتے تھے اور ایسے بزدل ہوتے تھے کہ حسن نظامی کو مجبوراً ان کے گھر سے نکلنا پڑتا تھا اور جن کو وہ کمزور اور بزدل خیال کرتا تھا وہ دلیر اور بے پرواہ ثابت ہوتے تھے۔

حسن نظامی پسند نہیں کرتا کہ ان مقامات و اشخاص کے نام لکھے کیونکہ اس سے

ناظرین کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

البتہ حضور نظام میر عثمان علی خان بہادر بادشاہ دکن کی شاہانہ ہمت کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ انہوں نے اوران کے سابق مدار المہام مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے ایک موقع پر کمال استقلال سے حسن نظامی کے ساتھ برتاؤ کیا جبکہ انگریزی پولس اور انگریزی حکام اعلیٰ ریزیڈنٹ کے بعض ناگفتہ بہ اشارات سے حسن نظامی کو بہت عجلت کے ساتھ حیدرآباد چھوڑنا پڑا اور وہ بمبئی چلا گیا تو بادشاہ دکن نے خود تار بھیجکر حسن نظامی کو راستہ سے واپس بلالیا اور کئی روز اپنا مہمان رکھا اور اس کی پروانہ کی کہ حکام انگریزی کو حسن نظامی سے باغیانہ شکوک شکوہ ہے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں آنریبل مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی اور سرچارلس کلیولینڈ ڈائرکٹر جنرل خفیہ پولس۔ اور مسٹر اور ڈ سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولس دہلی کی مہربانی سے حسن نظامی کی نگرانی دور کی گئی۔ اور اسوقت سے آج تک اب کسی قسم کی اذیت شک و شبہ کی پولس کے ہاتھوں سے اس کو نہیں ہے سوائے اسکے کہ اب بعض عوام انگریزوں کے میل جول کے سبب حسن نظامی کو خفیہ پولس کا ملازم یا حکام سے سازش کنندہ یا انگریزوں کا خوشامدی تصور کرتے ہیں۔

اسی موقع پر یہ ذکر بھی دلچسپ ہوگا کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب حسن نظامی ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے لئے ہندوستان سے باہر گیا۔ اور بیت المقدس کے واقعہ سرقہ تبرکات پر اس کی رائے روٹر کمپنی نے بذریعہ تار ہندوستانی اخبارات میں شائع کرائی تو اخبار وطن لاہور اور پیسہ اخبار لاہور نے اس قسم کے مخالفانہ مضامین حسن نظامی کے خلاف لکھے کہ مسلمانوں کو شبہ ہوگیا کہ حسن نظامی انگریزی جاسوس بنکر ان ملکوں میں گیا ہے اور انگریزوں نے اپنے خرچ سے اس کو بھیجا ہے۔ یہ بدگمانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ واحدی صاحب کو میرے سفر کے ایام میں باقاعدہ اس کی تردید شائع کرنی پڑی تب بھی بدظنی دور نہ ہوئی۔ اور جب ہندوستان واپس آکر پولس کی یورش حسن نظامی پر عام طور سے دیکھی گئی اسوقت خیالات بدلے۔

خدا کی شان ہے کہ وطن اور پیسہ اخبار نے ایک جھوٹی بدگمانی پھیلانیکا خمیازہ بہت جلدی بھگت لیا اور وہ دونوں اپنے اس مسلمہ اعتبار سے جو مسلمانوں کو اپنے تھا گر گئے یہانتک کہ اب مسلمان ان اخباروں کا نام لینے سے نفرت کرتے ہیں پڑھنا اور خریدنا تو امر دیگر ہے۔

وطن تو بالکل پردۂ گمنامی میں چھپ گیا۔ پیسہ اخبار کہیں کہیں دیکھا جاتا ہے اور حکام کی عنایت کے سبب اسکی رسائی اونچی اونچی جگہوں میں ہو جاتی ہے تاہم پبلک کی نظر میں اس کی ایک ذرہ کی برابر بھی وقعت نہیں ہے۔

مگر حسن نظامی آج بھی بدگمان نہیں ہے اور ان بدگمان اخباروں کو قومی خادم اور ایک خاص قسم کا کام آنے والا خدمت گزار قوم تصور کرتا ہے۔ اور انکے ایڈیٹروں کی دوستی اور ذاتی ملاقات پر اس کو مسرت ہے۔

یہ سرسری اور مجمل بیان حسن نظامی کی زندگی کا تھا اب زندگی کے جزئی واقعات کا فرداً فرداً ذکر کر کے ان سے مفید عوام نتائج نکالکر دکھائے جاتے ہیں تاکہ میرے بھائیوں کو ان سے سبق حاصل ہو۔ اور وہ سوانح عمری کے ان حصوں سے بہرہ ور ہوں جو خود ان کی زندگی کو بھی پیش آتے ہیں اور بے خبری میں ان سے کچھ حاصل نہیں کیا جاتا۔

حیاتِ حسن نظامی کے جزئیات

پہلا دور بچپن

حسن نظامی پیدا ہوا تو اس کے والدین نے قاسم علی نام رکھا۔ مگر اس کے ماموں سید بہادر علی شاہ صاحب علی حسن کہہ کر پکارتے تھے آخر یہی نام قرار پا گیا۔ چوبیس برس کی عمر تک رہا اور اس کے بعد حسن نظامی عرف ہو گیا۔ ابتدائی زمانہ میں اخباروں کے مضامین سید محمد علی حسن نظامی کے نام سے شائع ہوتے تھے حسن نظامی کے نام سے سب سے پہلا مضمون جلت زاغ کے عنوان سے اخبار وکیل امرتسر میں شائع ہوا۔ یہ مخفف نام دیکھکر حسن نظامی کے ایک قرابت دار نے بہت

مذاق اڑایا کیونکہ جسطرح حسن نظامی کو ہر کام اور ہر بات میں جدت کا خیال رہتا تھا اسی طرح میرے ان ہم سبق رشتہ دار کو جو کئی سال تک میرے رفیق تعلیم رہے تھے۔ ان جدتوں پر نکتہ چینی اور مضحکہ کرنے کا شوق تھا۔

ان یورشوں اور مخالفتوں کے زمانہ میں جنکا مجمل تذکرہ اوپر آیا ہے۔ میری قوم یعنی کنبہ دار علی حسن پر بہت زور دیتے تھے یعنی ہر تقریر اور تحریر میں علی حسن عرف حسن نظامی کہا جاتا اور لکھا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو غلط فہمی یہ تھی کہ حسن نظامی کے عروج ترقی کا باعث یہ نئی قسم کا نام ہے۔ اگر ہم اسکا قدیمی اور اصلی نام بکثرت شائع کریں گے تو اسکا بڑھنا رک جائے گا اور پھر اس کو کوئی شخص کوڑی کو بھی نہ پوچھے گا مگر آج ان کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ حسن نظامی نے خود اپنا اصلی نام لکھنے اور علی الاعلان ظاہر کرنے میں تامل نہ کیا (اس کتاب کی تحریر کے وقت تک کنبہ کے دشمنوں کو یہی وہم ہے کہ میری ترقی کا راز حسن نظامی نام میں ہے اسواسطے وہ شدومد سے علی حسن نام کا ذکر ہر اجنبی آدمی سے کرتے ہیں لہذا میں بھی ان کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں علی حسن ہوں میں علی حسن ہوں)

آج حسن نظامی کے حافظہ کی یہ حالت ہے کہ اپنے بچوں کے نام بھی بھول جاتا ہے اور کئی کئی منٹ سوچنے کے بعد انکا نام یاد آتا ہے لیکن بچپن کے واقعات کی یادداشت اتنی محفوظ ہے کہ دو ڈھائی برس کی عمر کے حالات ایسے یاد ہیں گویا ابھی پیش آئے ہیں۔

اچھی طرح یاد ہے کہ جب والدہ سے کچھ دیر کے لئے الگ ہوتا تھا یا اور کسی قسم کا خلاف مزاج واقعہ پیش آتا تھا تو میرے کلیجہ پر ایک بوجھ سا پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ بوجھ آہستہ آہستہ میرے اندرونی جسم کو کھرچتا اور میٹھی میٹھی سوئیاں چبھوتا ہوا آنکھوں کی طرف امنڈ کر آتا تھا جس سے خودبخود میرا چہرہ روکھا ہو جاتا تھا۔ دہانہ چر جاتا۔ ہوہو کی آواز حلق سے نکلنے لگتی آنکھوں سے آنسو اور ناک سے رینٹ بھی شروع ہو جاتی۔ رونے کی اس اندرونی کیفیت کا مجھے اتنا صحیح حس موجود ہے کہ اب جب

میں اپنے بچوں کو یا کسی دوسرے کے شیر خوار بچوں کو روتا ہوا دیکھتا ہوں تو شیر خوارگی کا ہو بہو رونا یاد آجاتا ہے اور میں سمجھ لیتا ہوں کہ رونا کیونکر آتا ہے اور رونے میں کیا حالت دل کی اور اندرونی جسم کی ہوتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شیر خوارگی کے زمانہ میں والدہ کی محبت اور اس کی عظمت کا احساس اتنا ہی زیادہ تھا جتنا کہ آج اکتالیس برس کی عمر میں ہے۔ اسمیں تو شک نہیں کہ اُسوقت کے سوچنے اور آجکل کے سوچنے میں بہت فرق ہے۔ شیر خوارگی میں وجوہات کا تصور نہیں تا تھا کہ والدہ مجھ سے کیوں محبت کرتی ہیں اور باپ بہن بھائی وغیرہ سے زیادہ ان کو میرے ساتھ کیوں تعلق ہے۔ اور آج میں ان وجوہات کو سوچکر ماں کی محبت کا اندازہ کرتا ہوں۔ تاہم محبت کے اثر کا محسوس کرنا ہر زمانہ میں یکساں تھا۔ شیر خوارگی کے انتہائی ایام میں میں اپنے والد کو بھائی کو بہن کو اور تیں بنانیوالی نانی کو اچھی طرح پہچانتا تھا لیکن والدہ سے زیادہ کوئی شخص مجھ کو عزیز نظر نہ آتا تھا اور کسی ذات سے مجھے وہ برقی رَو نکلتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی جو والدہ کی آنکھوں سے مجھ تک آتی تھی اور ان کے ہاتھوں اور گود میں محسوس ہوتی تھی۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ دُنیا میں سب سے بڑی خوشی اسمیں ہے کہ انسان سوائے خدا کے کسی کا تابعدار نہ ہو۔ اور اسکو اپنی آزادی کے اوپر پورا اختیار حاصل ہو لیکن ڈھائی برس کی عمر میں میرا حس یہ تھا کہ میری والدہ میرے ساتھ ہیں اور میں انکے پہلو میں لیٹا ہوا چاند کو دیکھا کروں۔

اس تحریر کا نتیجہ یہ ہے کہ جن پیر بھائیوں کے والدین یا والدہ زندہ ہوں وہ اُنکی قدر و عظمت اپنے دل میں جمائیں اور یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے والدین خصوصًا والدہ سے بڑھکر رشتوں اور تعلقات کی دنیا میں کوئی چیز نہیں بنائی۔

مجھے یاد ہے میری عمر تین سال کی تھی جب میں بیمار ہوا اور لستم (؟) احکام نیکے قریب ہوگئی۔ اسوقت درگاہ شریف میں بہادر شاہ بادشاہ کے کوئی

قریبی قرابت دار بحالت درویشی رہتے تھے۔ والدہ نے مجھ کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے کچھ پڑھ کر دم کیا اور چاندی کا ایک پترا منگا کر اپنے ہاتھ سے اس پر کوئی نقش کندہ کر دیا۔ جب یہ نقش میرے گلے میں ڈالا گیا۔ تو والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ یہ نادعلی ہے اور ہندوستان کے بادشاہ نے تمہارے لیے بنائی ہے۔ ہندوستان کے بادشاہ کہنے سے والدہ صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو میں نے پوچھا اماں کیوں روتی ہو؟ انہوں نے فرمایا بیٹا اب یہ بادشاہ نہیں رہے جنہوں نے تمکو نادعلی دی ہے اور انکی بادشاہی انگریزوں نے چھین لی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے بادشاہ اور انگریزوں کا نام سُنا۔ میرا خیال ہے کہ دل میں تیموریہ خاندان کی محبت کا یہ پہلا تخم تھا جو والدہ ماجدہ نے بویا۔

اس واقعہ سے پیر بھائی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر ان کی عورتیں چھوٹے بچوں کے سامنے دین اور ایمان کی اور دنیاوی حوصلہ مندیوں کی اچھی اچھی باتیں بیان کیا کریں تو بچے انکو کبھی نہیں بھولیں گے اور شروع ہی سے انکی ایک پختہ ایمانی خصلت تیار ہو جائے گی۔

چار برس

کچھ کم عمر تھی دروازہ پر ایک بھکاری فقیر کو میں آٹا دینے کے لئے گیا اس فقیر نے میرے گلے میں سے نقرئی نادعلی اُتارنی چاہی مگر میں نے مزاحمت کی اور اس کے ہاتھ میں کاٹ کھایا فقیر نے میرا منہ مسل دیا اور گلا گھونٹنے لگا اسی اثنا میں کوئی عزیز آ گئے اور انھوں نے مجھ کو فقیر کے ہاتھ سے چھڑایا۔ یہ تو یاد نہیں کہ میرے گھر والوں نے اس فقیر کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن یہ بات اب تک دلپر جمی ہوئی ہے کہ ہٹے کٹے اور موٹے تازے گداگر عموماً جرائم پیشہ ہوتے ہیں اس واقعہ کا اثر ہے جو بچپن میں پیش آیا تھا کہ میں پیشہ ور گداگروں سے سخت نفرت اور عداوت رکھتا ہوں قرآن شریف کا حکم وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ اور مانگنے والے کو مت جھڑکو میری آتش انتقام کو ٹھنڈا نہ کرتا رہتا تو معلوم نہیں کہ عہد طفلی کی یہ یاد داشت مجھے کیسا سنگدل بنا دیتی۔

اس سے بھی پیر بھائی بچپن کی اس قوت کا اندازہ کرینگے۔ جو ہر قسم کا اچھا برا اثر مضبوطی سے قبول کر لیتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی

میں پانچ برس

کا تھا۔ ننگے پاؤں گلیوں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ ایک بار خوارگی کا ایک ہاتھ میں ٹھیکرے لیئے ہوئے اچھلتا کودتا چیختا چلاتا شام کے وقت گھر میں آیا دیکھا والدہ صاحبہ نے کوری مٹی سے زمین لیپی ہے اسپر سفید فرش بچھایا ہے لوبان جل رہا ہے طباق میں حلوا بھرا ہوا رکھا ہے۔ اور وہ کسی انتظار میں بیٹھی ہیں۔ میں نے حلوے کو دیکھتے ہی ٹھیکرے اور سر کنڈے ہاتھوں سے پھینک دیئے اور مٹی میں بھرے ہوئے ننگے پاؤں سے اجلے فرش پر دوڑا ہوا چلا گیا اور بغیر پوچھے گچھے حلوے کے طباق میں ہاتھ ڈال دیا۔ یہ دیکھتے ہی والدہ صاحبہ بہت گھبرائیں اور ناراض ہو کر چلائیں۔ ارے ٹھہر ٹھہر کیا کرتا ہے یہ پیر پیغمبروں کی نیاز کی چیز ہے اس میں گندے سندے ہاتھ نہیں ڈالا کرتے اور نہ میلے پاؤں لیکر اس پاک بچھونے پر آتے ہیں۔ ابا آتے ہوں گے وہ آنکر نیاز دینگے جب نیاز ہو جائے گی تب ہم تمہارے ہاتھ دھلائیں گے اسوقت کھانا۔

مجھے یاد

ہے پیر پیغمبروں کا نام سنکر میں لرز گیا اور ان نامونکا ایسا خوف مجھ پر طاری ہوا کہ میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا کہ پیر پیغمبر کیا ہوتے ہیں۔ والدہ کو اس سوال پر ہنسی آگئی اور انہوں نے فرمایا کہ وہ خدا کے پیارے بندے ہوتے ہیں انکا ادب کرنا اور انکی نیاز کی چیز کا ادب کرنا بہت ضروری بات ہے۔ اس واقعہ کا اثر مجھ پر اتنا ہوا کہ عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اولیاء اللہ کی کچھ بیوقعتی میرے دل میں ہو گئی تھی لیکن اس زمانہ میں بھی جب اس حلوے اور پیر پیغمبر کی نیاز کا قصہ مجھ کو یاد آتا تھا تو علمی فلسفے ذہن سے کافور ہو جاتے تھے۔ اور پیر و پیغمبر کی غیر معمولی عظمت محسوس ہونے لگتی تھی۔

اگر پیر بھائی اور ان کی عورتیں عہد طفلی سے بزرگان دین کا ادب سکھائیں تو بچے بعد کی ترغیبات سے کبھی متاثر نہ ہوں۔

میں چھ برس کا تھا

اماں نے مجھے دو پیسے دئے انکا ایک شیر کا کھلونا اور ایک

قریبی قرابت والی عورت تھی۔ میں نے پوچھا کہ اماں یہ عورت کس کی ہے؟ انہوں نے فرمایا ملکہ وکٹوریہ کی جو آج کل ہندوستان کی بادشاہ ہے اور یہ شیر کا پیسہ اس زمانہ کا ہے جب انگریزوں کی کمپنی کا راج تھا۔ میں نے کہا اماں میری صورت کا پیسہ کیوں نہیں بنا؟ ان کا دل چونکہ اسلامی حکومت کے انقلاب کے سبب بہت دکھا ہوا تھا۔ میری درخواست سنکر رونے لگیں۔ اور کہیں کہ بیٹا مسلمانوں کی بادشاہت ہوتی ہے تو وہ کلمہ کا روپیہ پیسہ بناتے ہیں۔ صورت بنانی ان کے ہاں حرام ہے۔ خدا تم کو بادشاہ بنائے گا۔ تو کلمہ کا روپیہ پیسہ چلانا۔ یہ صورت تو مٹ جانے والی چیز ہے سدا نام اللہ کا رہتا ہے۔ اور کلمہ میں اللہ کا نام ہے۔

کلمہ اور اللہ کے نام اور بادشاہ بننے کا خیال اسی دن سے دل میں سما گیا۔

پس بھائیوں اور بہنوں کو لازم ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کے سامنے اسی قسم کی دینی اور دنیاوی باتیں کیا کریں جن سے ان کے دماغ میں بڑے بڑے ارادے پیدا ہوں۔

میں سات برس کا تھا

دیکھا طاق میں چوڑیاں رکھی ہیں۔ میں نے چند چوڑیاں اتار کر ہاتھوں میں پہن لیں۔ والدہ نے دیکھا تو خفا ہوتی ہوئی دوڑیں اور فرمایا۔ اتار چوڑیاں پہنیں تو امام مہدی کے ساتھ جہاد کرنے میں تلوار نہیں اٹھا سکے گا۔ میں نے فوراً چوڑیاں اتار ڈالیں۔ اور اماں سے پوچھا۔ امام مہدی کون ہیں۔ اور جہاد کیا چیز ہے۔ فرمایا آخر زمانہ میں امام مہدی ظاہر ہوں گے۔ اور مسلمانوں کے دشمنوں سے لڑیں گے۔ اس وقت ہر مسلمان ان کے ساتھ ہو کر تلوار اٹھا کر جہاد کرے گا۔ جہاد دین کی لڑائی کو کہتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد مجھ کو چوڑیوں سے اس قدر عداوت ہو گئی کہ جس کی چوڑیاں میں دیکھتا ان کو توڑنے کو دوڑتا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ چوڑیاں بہت بری چیز ہوتی ہیں۔ اور ان کے سبب آدمی امام مہدی کے ساتھ جہاد نہیں کر سکتا۔ امام مہدی سے تعلق بھی اسی عمر میں پیدا ہوا۔ جیسا اور جسم کا تعلق تھا۔ اب اس کی اور کیفیت ہو مگر تعلق جیسا کچھ تھا۔ اب بھی ہے۔

پیر بہنوں کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیئے۔ اس سے زیادہ لکھنا مناسب نہیں۔

مکتب میں داخل ہونے کے وقت میری عمر پانچ برس کی تھی۔ سات برس کی عمر میں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں بڑا آدمی ہوں اور تیموری شہزادوں کے بچوں کی امداد حاصل کرکے (جو میرے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے) میراثیوں قصائیوں اور بڑھیوں کے لڑکوں پر حکومت کرنے کے سامان مہیا کرتا تھا۔ جو لڑکا میری اطاعت سے انحراف کرتا مکتب سے باہر نکلکر دوسرے لڑکوں سے اسکو پٹواتا تھا۔ یہاں تک کہ سب لڑکے مجھ سے ڈرنے لگے تھے اور مجبوراً میرے اشاروں پر چلتے تھے۔

ایک دفعہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو میرے ان مظالم کی اطلاع ہو گئی، اور انہوں نے مجھ کو بہت تنبیہہ کی۔ میں نے اپنے جاسوسوں سے پوچھا کہ کس نے میری چغلی کھائی تھی تو معلوم ہوا کہ عرب سرائے کے ایک دولت مند میراثی معاملہ خان ٹھیکیدار کے لڑکے ابراہیم کا یہ کام تھا۔ پسند آسانی سے ہمت نہ ہوئی کہ میں ابراہیم کو سزا دیتا کیونکہ اس کے ساتھ بھی لڑکوں کا ایک جتھا تھا۔ اسواسطے میں نے کئی دن تک خاموشی اور صبر سے اسکو سوچا اور آخر ذہن نے تجویز کیا کہ شہزادوں کے لڑکوں سے کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ مرزا کلّے مرزا سمندا وغیرہ لڑکوں کو لے کر مرزا غالب کے مقبرہ میں گیا۔ اور ان کی لوح کے اوپر بیٹھ کر میں نے ان شہزادوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اور ان سے کہا کہ تم شہزادے ہو۔ اور ہم پیرزادے ہیں۔ اس میراثی نے آج میری چغلی کھائی ہے۔ کل تمہارے ساتھ یہی ہوگا۔ اس سے بدلہ لینا چاہیئے۔ مرزا سمندا نے کہا ابراہیم میرے ہاں کبوتر دیکھنے آیا کرتا ہے۔ میں اسکو وہاں نہیں آنے دونگا۔ مرزا کلّے بولے میں مرغ بازی کا تماشا جو میرے گھر میں ہوتی ہے اس کو نہیں دیکھنے دونگا۔ میں نے کہا یہ بھی نہ کرو۔ اور یہ بھی کہ ابراہیم کے ساتھی لڑکوں سے یارانہ کیا جائے۔ میں اپنے گھر سے چنے اور کشمش ناشتہ کے لیئے لاتا ہوں اسمیں سے ان لڑکوں کو دیا کروں گا۔ اور تم بھی گھر سے لاکر ان کو کھلایا پلایا کرو۔ جب سب لڑکے ہمارے دوست

بن جائینگے۔ تو ابراہیم اکیلا رہ جائے گا۔ اور ہم سب مل کر اسکو خوب ماریں گے ان دونوں نے اس رائے کو قبول کیا۔ مگر افسوس ہے کہ میواتی لڑکوں نے ہماری چیزیں کھائیں بھی۔ مگر لڑائی کے وقت ہمارا ساتھ نہ دیا۔ ابراہیم کے ساتھ ہو گئے۔ تب بھی ہماری جماعت اتنی زیادہ تھی کہ عربسرائے کے سامنے نہر کے کنارے سے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ اسکے بعد ابراہیم ہمارا دوست بن گیا اور ایسا دوست کہ آج اس مرحوم کے یاد کرنے سے بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ اور دہلی میں جب کبھی تانگہ چلانے والا اسکا چھوٹا بھائی مل جاتا ہے تو میں اسکا تانگہ کرایہ پر لیتا ہوں۔ اور دوسروں سے سوایا کرایہ اسکو دیتا ہوں

اس واقعہ میں پیر بھائیوں کے لیئے مجھ کو کوئی نتیجہ نظر نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ بچپن کی دلچسپ خصلتوں کا حال انھوں نے سُنا۔

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا محمد اسمعیل صاحب نے مکتب کے سب لڑکوں کو انجمہ کے لیئے ڈھیلے لانے کے واسطے جنگل بھیجا۔ میواتی لڑکے کھودتے تھے اور ہم اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ یکایک میری نگاہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر گئی۔ جسکا تختہ سرک گیا تھا اور لحد میں ایک کھوپری اور پنڈلی اور گھٹنے کی ہڈیاں پڑی نظر آتی تھیں یہ منظر دیکھ کر میں ڈر گیا اور ایسا ڈرا کہ بخار چڑھ آیا۔ واپس آکر میں نے مولوی صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا جو بچے اپنے ہم مکتبوں کو ستاتے ہیں ان کا حال قبر میں جا کر یہی ہوتا ہے۔

یہ واقعہ سنکر مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اسکے بعد پھر میں نے کسی ہم مکتب لڑکے کو نہیں ستایا۔ اور برسوں قبر کا خیال مجھکو ڈراتا رہا۔ اور اب بھی وہ منظر جب سامنے آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پیر بھائی بھی اگر بچوں کو نیک بنانے کے لیئے اس قسم کی نصیحتیں کیا کریں۔ تو بہت اچھا نتیجہ پیدا ہو۔ مگر خیال رہے کہ زیادہ خوفناک قصّے بیان کرنے فائدہ کے بجائے نقصان

ہیں۔ کیونکہ اس سے بچے ڈرپوک اور بزدل بن جاتے ہیں۔

میرے والد

صرف حافظ قرآن تھے۔ اردو لکھنا پڑھنا ان کو نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ میرے بھائی باہر سفر میں گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا تو والد نے ایک ایسے شخص سے پڑھوایا جو ہمارے خاندان کے پرانے دشمن تھے۔ ضرورت کے سبب پڑھوا تو لیا مگر والد کو اسکا بہت دیر تک رنج رہا۔ میں مکتب سے واپس آیا اور انکو مغموم دیکھکر خود بھی مغموم صورت بنا کر پاس بیٹھ گیا۔ اس وقت میری عمر آٹھ برس کی تھی۔ والد کو میری یہ ادا شاید اچھی معلوم ہوئی ہو گی۔ وہ مسکرانے لگے اور فرمایا تم جلدی جلدی پڑھ لو تاکہ ہم خط لکھوانے اور پڑھوانے میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ دیکھو ہم نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تو اسکا خمیازہ اٹھایا کہ آج اپنے بڑوں کے پرانے دشمن کو تمہارے بھائی کا خط دکھانا پڑا۔ میں نے پوچھا ابا وہ دشمن کون ہیں۔ تو والد نے ان کا نام بتا دیا۔ اور پھر ان کے تمام خاندان کے آدمیوں کے نام لیے۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ اور ان کے بڑے مدتوں سے ہمارے اور ہمارے بڑوں کے دشمن ہیں۔ ان کے پاس روپیہ ہم سے زیادہ ہے اور آدمی بھی ہم سے زیادہ ہیں۔ مگر ہم اور ہمارے بڑے ہمیشہ ان پر زور رہتے ہیں۔ میں نے کہا ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کسی سے کینہ اور دشمنی رکھنا گناہ ہے۔ والد نے فرمایا کہ مولوی صاحب سچ کہتے ہیں لیکن جب دوسرا آدمی خواہ مخواہ عداوت اور نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو تو اس سے دبنا اور کلمہ بکلمہ جواب نہ دینا بھی گناہ ہے۔ ہمارے بڑے بہادر تھے اور بہادر کبھی کسی سے دب کر نہیں رہتے۔

یہ تقریر سنکر مجھ پر دو اثر ہوئے ایک تو یہ کہ پہلے سے زیادہ لکھنے پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ اور دوسرے یہ کہ جن جن لوگوں کا ابا نے نام بتایا تھا۔ ان سب کی دشمنی کا خیال میرے دل پر نقش کالحجر کی طرح رہنے لگا۔

اس موقع پر میرے بھائیوں کے سامنے مجھے صاف صاف باتیں کرنے کی ضرورت ہے

مجھے بتانا چاہئے کہ حسد و کینہ اور عداوت بہت بری چیز ہے والد مرحوم نے مجھے جو کچھ نصیحت کی وہ خاندانی روایات کا ایک ورثہ تھا۔ جو انہوں نے مجھ تک پہنچایا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اگر انسان خود کسی کے ساتھ دشمنی کا خیال دل میں نہ رکھے اور عداوت سے دشمن پیدا نہ کرے اور صرف دشمن کے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہے تو ایک دن وہ دشمن خود بخود دوست بن جاتے ہیں اور دوسرا خیال یہ ہے جو جنگ یورپ اور بڑی بڑی قوموں کی باہمی عداوتوں کے تجربے سے پیدا ہوا ہے کہ عداوت انسان کو مضبوط کرتی ہے۔ چوکنا اور ہوشیار رکھتی ہے مضبوط ہونے ترقی کرنے اور شاندار بننے کی ہمت و جرات پیدا کرتی ہے جس قوم کے افراد میں کسی دوسری قوم سے عداوت نہ ہو اس کی ترقی کا جوہر فنا ہو جاتا ہے اور وہ ٹھٹر کر رہ جاتی ہے۔

بیشک جنگ یورپ نے یہ سبق پڑھایا کہ تقدیر اور اس کا خالق خدا ہم انسانوں کے کاموں میں پورا اختیار و اقتدار رکھتے ہیں۔ اور خدا کی مرضی کے بغیر کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی جیسا کہ ہم نے دیکھا۔ اور دیکھیں گے۔ کہ بڑی بڑی طاقت دار اور ناقابل شکست قومیں مغلوب و مفتوح ہو گئیں تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ نتیجوں کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اور وہی قوم آخر کو کامیاب ہوگی جس کا بھروسہ خدا پر ہے اور حریف کی عداوت میں اسکے تمام قوائے جسمانی شریک و متحد و لبریز و سرشار ہیں۔

میرے والد نے جن خاندانی دشمنوں کا ذکر کیا۔ وہ ہمارے کنبہ کے لئے بنی امیہ کی سی مثال رکھتے ہیں۔ کہ بنی ہاشم سے ان کا جتھا بھی زیادہ ہے۔ انکی عقلیں اور تدبیریں بھی تیز ہیں اور دولت بھی ہمارے خاندان سے بہت زیادہ ان کے پاس ہے۔ اگر ہمارے بزرگ عداوت کا حس ہم میں پیدا نہ کرتے تو ہم حریفوں کی حکمت عملیوں سے غافل رہ جاتے اور وہ حسب فلسفہ تنازع البقا ایک دن ہم کو اسی طرح نیست و نابود کر دیتے جس طرح کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں اور بڑے کیڑے چھوٹے کیڑوں کو چٹ کر جاتے

ہیں اور بڑے درخت چھوٹے پودوں کو اپنے سایہ میں پنپنے نہیں دیتے۔

حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد سے یہ عداوت شروع ہوگئی تھی حضرت محبوب الٰہیؒ کے بعض قرابت داروں کو گوارا نہ تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ خواجہ سید محمد امام و خواجہ سید موسیٰ فرزندان حضرت مولانا سید بدر الدین اسحٰق سے ایسی محبت و یگانگت کا برتاؤ کریں۔ اور ان کو اتنا امتیاز دیں کہ مجلس کی نشست میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے بعد خواجہ سید محمد امام سے کسی کو فوقیت نہ ہو۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی موجودگی میں خواجہ سید محمد امام کا لوگوں کو مرید کرائیں۔ اور اپنے روبرو خواجہ سید محمد امام کو صاحب سماع بننے کی اجازت دیں۔ اور ہوتے ساتے اپنے اور بڑے بڑے نامور خلفا اور بڑی بڑی عمر کے قرابت داروں کے خواجہ سید محمد امام ہی کو میر مجلس قرار دیں اور کسی دوسرے کو یہ امتیازات اور یہ خصوصیات عطا نہ ہوں۔

میں نے بالکل درست مثال دی ہے کہ ہمارے خاندان اور دوسرے لوگوں کا معاملہ بالکل بنی ہاشم اور بنی امیہ کا سا ہے۔ سب مسلمانوں کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلعم جتنی زیادہ محبت حضرت علیؓ سے فرماتے تھے۔ اور جس قدر نزدیکی و تقرب کے امتیازات حضرت علیؓ کو عطا ہوتے تھے۔ یہ سب بنی امیہ کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ اور اموی خاندان کا ہر آدمی علیؓ کی ان خصوصیات عالی کو ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکتا تھا یہ خیال کسی اموی کو نہ ہوتا تھا۔ کہ حضرت علیؓ کی سی اہلیت۔ قابلیت اور آنحضرت صلعم کے ساتھ فدائیت بھی کسی اور میں ہے؟ جن کے سبب آنحضرتؐ کسی دوسرے کو بھی یہ امتیازات مرحمت فرماتے۔ حضرت خواجہ سید محمد امام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کہ وہ یتیمی کی حالت میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے بلانے سے یہاں آئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے پیر کا نواسہ اور اپنے مربی و معلم روحانی کا فرزند سمجھ کر نہایت محبت و ادب سے فرزند حقیقی کی طرح ان کو پالا اور تربیت کیا۔ اور خواجہ سید محمد امام نے بھی ہوش سنبھال کر حضرت محبوب الٰہیؒ کو ہی اپنا باپ۔ اپنا پیر، اور اپنا سب کچھ جانا

اور ان کے ساتھ ایسے وابستہ ہوگئے جیسے حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے ساتھ ہوگئے تھے حضرت خواجہ سید محمد امام میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی خاص توجہ و تربیت کے سبب علمیت و قابلیت تقویٰ و طہارت۔ ذوق و شوق اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ فدائیت اسی شان کے ساتھ تھی جیسی کہ حضرت علیؓ میں پائی جاتی تھی پھر حضرت خواجہ سید محمد امام کے ساتھ حضرت محبوب الٰہی کے اقربا بنی امیہ کا سا برتاؤ کیوں نہ کرتے حضرت محبوب الٰہیؒ کے وصال ہوتے ہی حضرت خواجہ سید محمد امام اور ان کے بھائی کے ساتھ وہی برتاؤ شروع ہوگئے جو حضرت علیؓ کے ساتھ ہوئے تھے وہ دن ہے اور آج کا دن یہ کشمکش برابر موجود ہے۔ مگر جس طرح بنی فاطمہ ملکی حکمرانیوں سے محروم رہے مگر ان کی روحانی و باطنی شہریاریاں تمام عالم پر چھا گئیں۔ اور انکی دینی سلطنت کا سکہ دنیا کے سب ملکوں میں چلا چل رہا ہے۔ اور چلتا رہے گا۔ اسی طرح سے حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد دنیاوی توڑ جوڑ کی باتوں میں تو مغلوب و مفتوح رہی، لیکن ان کی روحانی و باطنی برتری چھ سو برس سے آج تک قائم ہے۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی روح پر فتوح کا تعلق آجتک خواجہ سید محمد امام کی اولاد سے جوں کا توں ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ عالم حیات میں تھا۔

انتہائی مصیبتوں کے زمانہ میں جبکہ خواجہ سید محمد امام کی اولاد کو اپنے حریفوں سے محفوظ رہنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنی قدیمی روایات کی بموجب حضرت محبوب الٰہی صاحب کے روضہ میں جاتی ہے۔ ان کے مزار کا غلاف پکڑتی ہے اور رو رو کر کہتی ہے۔

"ہم آپ کے ہیں اب یہاں سے کہاں جائیں آپ ہی ہمارے سرپرست اور مربی تھے۔ ہیں اور رہیں گے۔ آپ ہی ہم بیکسوں کی پناہ ہیں۔ آپ ہی ہم بے سہاروں کا سہارا ہیں آپ ہی کی شفقت و عنایت کے بھروسہ پر ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں ہمارے لیے عرض کیجئے تاکہ ہم ان فتنوں سے محفوظ رہیں۔ اور یہ دروازہ اور یہ دامن ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے جسکو چھڑانے کی کوششیں کی جاتی ہیں"

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خواجہ سید محمد امام کی اولاد نے یہ آخری نسخہ یاد کی ہو اور وہ محروم رہی ہو۔ بلکہ ہمیشہ اور فوراً اسکی مشکلات کی کشائش نامعلوم اور غیبی ذرائع سے ہو جاتی ہے۔

پس میرے والد مرحوم حضرت خواجہ سید محمد امام کی اولاد میں تھے۔ اور ان کا فرض تھا کہ مجھکو ان قدیمی و خاندانی حقیقتوں سے آگاہ کردیں۔ جیسا کہ انہوں نے کیا۔

نو برس کی عمر

میرے والد نے ایک ترکی ٹوپی جس کا رنگ بہت لال تھا مجھ کو لاکر دی اسکو اوڑھ کر مجھے اپنی بادشاہی و برتری کا خیال پیدا ہوا۔ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ شریف میں مزار کے پائنتی جو سنگ مرمر کا فرش ہے اس میں لال رنگ کا ایک پتھر ہے۔ میں لال ٹوپی اوڑھ کر اس لال پتھر پر بیٹھا کرتا تھا اور سب لڑکوں سے کہتا تھا کہ مجھے بادشاہ کہو۔ اور درگاہ کے خیموں کے اوپر چڑھ کے بیٹھتا اور دوسرے ہم عمر بچوں سے کہتا میں تمہارا بادشاہ ہوں میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میرے پیارے اور مرحوم بھائی سید محمد غوث نے ایک وقت میرے دعوئے سلطنت سے انحراف کیا تو میں نے دوسرے لڑکوں کو حکم دیا کہ ان کو مارو۔ ان لڑکوں نے کہا ہم نے تمہاری بادشاہی کو اسلئے مانا ہے کہ تم ہمکو اپنا وزیر بنالو اسلئے نہیں مانا کہ ہم دوسروں سے لڑیں بھی۔ میں یہ جواب سن کر آپے سے باہر آگیا۔ اور کہا کچھ ڈر نہیں ہے میں اکیلا ہی لڑونگا چنانچہ میں لڑا اور اپنے بھائی مرحوم سے جسمانی قوت کم رکھنے کے باعث خوب پٹا۔ سید محمد غوث مرحوم نے میرا چہرہ لہو لہان کر دیا۔ اور ایسی گت بنائی کہ دوسرا کوئی لڑکا ہوتا تو پھر کبھی بادشاہی کا نام نہ لیتا مگر میں نے دوسرے ہی دن پھر اپنے فاتح بھائی سے کہا۔ کہ مجھکو بادشاہ مانو ورنہ میں تم سے پھر لڑونگا۔ مرحوم سید محمد غوث مجھ سے عمر میں ذرا کچھ بڑے تھے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے مجھ سے کام لیا اور ہنسکر بولے میں تمہاری بادشاہی کو مانتا ہوں مگر خیمہ کے اوپر تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔ مجھ سے ہاتھ باندھ کر کھڑا نہیں ہونگا۔ میں نے کہا تو منظور ہے میں تمہیں خیمہ پر بیٹھنے کی اجازت دونگا۔ مگر اپنے خیمہ پر نہیں۔ جو خیمہ میرے خیمہ سے

ذرا نیچا ہے تم وہاں بیٹھو۔ کیونکہ تم بادشاہ نہیں ہو اور میں بادشاہ ہوں چنانچہ میرے مرحوم بھائی نے ایسا ہی کیا کہ وہ مجھ سے نیچے خیمہ پر بیٹھے۔

میرے بچپن کے زمانہ میں اگر میری قوم کے اندر حکومت لینے اور فاتح بننے کا مادہ موجود ہوتا تو میں یقیناً اپنی جبلی خواہش اور قریبی تاثرات سے فائدہ اٹھا کر کہیں نہ کہیں کا بادشاہ ہو جاتا۔ مگر میرے گرد و پیش تو کوڑیاں مانگنے اور "جو کچھ نذر ہو اس غلہ میں ڈال دیجئے" کی آوازیں تھیں۔ میں کیونکر فاتح بنتا۔ مجھ پر تو اس پاس کی حالتوں نے یہ اثر ڈالا کہ اپنے خاندان کے دوسرے بچوں کی طرح میں بھی بھیک مانگنے لگا "جو کچھ نذر ہو اس غلہ میں ڈال دیجئے" کہنے لگا۔ اور دو آنہ آتے تو ایک آنہ چرا کر ایک آنہ ظاہر کرنے لگا۔

چوری کرنیکا گناہ

خدا کے فضل سے میری ساری زندگی چوری اور دغابازی سے پاک ہے۔ مگر بچپن میں جس قسم کی چوریاں میں نے کیں ان کے خیال سے روح ہمیشہ نادم رہے گی۔ اور جب یہ واقعات یاد آتے ہیں ضمیر مجھ کو اداس کر دیتا ہے۔ اگرچہ جب میں نے ان چوریوں کا ارتکاب کیا اسوقت میں ان کو چوری نہ سمجھتا تھا۔ اور تمام درگاہ والوں کو اسمیں مبتلا پاتا تھا (جو آج تک اسمیں مبتلا ہیں)

اس چوری کی حقیقت یہ ہے کہ درگاہ کے اندر درگاہ والوں کے حصے مقرر ہیں اور حصہ دار آپس میں ایک دوسرے کی چوری کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ایک حصہ دار موجود نہیں ہے اور درگاہ میں کچھ نذر آئی تو دوسرے حصہ دار نے اس نذر کو چرا لیا اور اپنے شریک حصہ دار کو اسکی خبر نہ کی۔ یا ایک روپیہ آیا تو آٹھ آنے بتائے۔

دوسری صورت چوری کی یہ ہے کہ درگاہ کے زیارت کرنے والے نے مثلاً ایک روپیہ کی مٹھائی نیاز دلانے کو بازار سے منگائی تو درگاہ والہ لازمی طور سے بارہ آنے کی لائے گا۔ چار آنہ چہارم کے نکال لینے اپنا حق تصور کرے گا۔ کیونکہ درگاہ والوں کا یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔ مجھے معلوم ہو کہ جن حصہ داروں کی میں نے چوری کی۔ ان حصہ داروں نے مجھ سے دس حصہ

زیادہ میرے حق میں چوریاں کی ہونگی کیونکہ میں درگاہ میں بوجہ سلسلہ تعلیم کی مصروفیت کے بہت کم حاضر رہ سکتا تھا۔ اور وہ ہر وقت رہتے تھے۔ تاہم میرا ضمیر ان باتوں سے مطمئن نہیں ہے۔ اور اسکو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے حصہ داروں کا حق چرالینا ایک صاف اور کھلی ہوئی چوری تھی جس کا ارتکاب میں نے بارہا کیا اور باوجود تلافی کی کوشش کرنے اور چوری کی مقدار سے زیادہ واپس دینے کے میرا دل خدا کے سامنے شرمندہ ہے۔ اور بچپن کی چوری کا دھبہ اور داغ خیال سے دور نہیں ہوتا۔

آج میری روح اپنے اور اپنے خاندان کے بچوں کو اس بلائے سرقہ سے محفوظ رکھنے کو تڑپتی ہے اور میں خدا سے دعائیں مانگتا ہوں کہ ان سب کی معاش کو اس گناہ اور ذلت سے محفوظ رکھنے کی توفیق عنایت فرما۔ اور ایسے سامان پیدا کر کہ وہ سب ان گناہوں سے پاک و صاف رہیں۔

جوتیوں کی حفاظت کا ایک آنہ

اس کتاب کے لکھنے کے زمانہ میں ایک دن ایک دوست کے ہمراہ درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی میں حاضر ہوا۔ اور جوتیاں باہر چھوڑیں (جیسا کہ قاعدہ ہے) وہاں جو محافظ فقیر بیٹھا تھا واپسی کے وقت اسکو کچھ دینا چاہا۔ مگر جیب میں اسوقت پیسے نہ تھے۔ روپے تھے۔ میں نے ایک روپیہ اس فقیر کو دیدیا۔ اسی وقت مجھ کو یاد آیا کہ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی جوتیوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ اور ایک آنہ کا دلچسپ واقعہ پیش آتا تھا میرے بچپن میں فقیر دروازہ پر نہ ہوتا تھا بلکہ درگاہ کے متعلقین میں سے بعض لوگ یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ اور اس میں ان کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی جوتیوں کی رکھوالی کر کے پیسے کماتا تھا۔ چنانچہ ایک دن ایک ہندو بابو کی جوتیوں کی حفاظت میں نے کی۔ اور جب وہ باہر آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تم کو کیا دوں میں نے کہا جو آپکا جی چاہے۔ وہ بولا جو تم مانگوگے وہی دونگا۔ تم خوب سوچ کر مانگو اور جتنا زائد مانگ سکتے ہو کہو۔ میں وہی دونگا۔ میں نے سوچا تو

مجھ کو چار پیسے بہت زیادہ معلوم ہوئے۔ کیونکہ اور لوگ ایک پیسہ دیا کرتے تھے اور چار پیسے سے زیادہ مجھے اور کسی رقم کا حال معلوم نہ تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ مجھے تم چار پیسے دو وہ بابو یہ جواب سنکر ہنسا اور اس نے چار پیسے مجھ کو دیدیئے۔

اس کے جانے کے بعد میرے خاندان کے لوگوں نے مجھکو بہت طعنے دیئے۔ اور کہا کہ بڑا کم ظرف ہو۔ چار پیسے سے زیادہ نہ مانگے۔ ایک صاحب نے کہا اس کے بڑے بھی کم حوصلہ اور چھوٹے دل کے تھے۔ مجھ کو ان باتوں سے بہت صدمہ ہوا اور یہ واقعہ میرے دل پر نقش ہو گیا کہ لوگوں نے میری اس حرکت کے سبب میرے بزرگوں کو بھی برائی سے یاد کیا۔

طفلی اور ناسمجھی کے زمانہ میں کوئی شخص بھی حوصلہ مند نہیں ہوتا اور اسکو خبر نہیں ہوتی کہ زیادہ اور کم میں کیا فرق ہے۔ تاہم فقیر کو روپیہ دیتے وقت مجھے اپنا بچپن یاد آیا اور میں نے اپنے نفس کو یاد دلایا کہ تیری اصلیت اتنی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر کہ آج اس نے تجھکو اتنا دیا کہ تو نے ایک روپیہ کا دیدینا کچھ بات نہ سمجھا پیر بھائیوں کو اس مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ جب خدا ان کو عروج دے تو وہ اپنی سابقہ حالت کو یاد کیا کریں۔ اس سے ان کو ادائے شکر اور فضل خدا کی احسانمندی کا لطف آئے گا جو تصوف کی روح رواں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت۔ میری عمر دس سال کی تھی۔ رات کو خواب دیکھا کہ میں ایک پہاڑ پر ہوں صبح صادق کا وقت ہے۔ اور کچھ لوگ حلقہ بنائے ہوئے اس پہاڑ پر کھڑے ہیں جن کے وسط میں ایک صاحب ہیں جنکو لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت رسول خدا صلعم ہیں۔ میں آ کر میں حلقہ کو چیر کر اندر گھس گیا۔ اور حضور کے چہرہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اسوقت تک سورج نہیں نکلا ہے۔ مگر حضورؐ کے چہرہ پر دھوپ آ رہی ہے۔ میں اسکو نہ دیکھ سکا۔ اور بیتاب ہو گیا کہ حضورؐ کے چہرہ پر دھوپ کیوں ہے میں نے اپنے دونوں ہاتھ ملا لیئے۔

اور اچک اچک کر حضورؐ کے چہرہ کی دہوپ روکنے لگا چونکہ میرا قد چھوٹا تھا اسلیئے ہاتھ چہرہ تک نہ جاسکتے تھے لیکن بار بار اچکنے سے میرا قد اونچا ہوگیا اور میں نے اپنے ہاتھوں سے حضورؐ کے چہرہ کی دہوپ روک لی۔ جب دہوپ رک گئی تو میں بہت خوش ہوا اور حضورؐ نے تبسم فرماکر مجھ کو دیکھا جس سے میں نے محسوس کیا کہ حضورؐ میری اس خدمت سے خوش ہوئے۔

صبح کو میں نے یہ خواب اپنے استاد مرحوم حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے بیان کیا انھوں نے فرمایا تمہارے ہاتھوں سے دین اسلام کا کوئی رخنہ درست ہوگا اور وہ ایسا رخنہ ہوگا جس سے حضور سرور کائنات صلعم کی روح مطہر کو اذیت ہو رہی ہوگی۔

اس تعبیر نے میرے ارادوں میں جو اسوقت بالکل خردسال تھے ایک بزرگی اور بلندی پیدا کردی۔ اور اب جب میں کوئی اچھا اور دینی کام شروع کرتا ہوں۔ یہ خواب مجھکو یاد آتا ہے اور ایک زندگی میرے اندر پیدا کرتا ہے۔

مطبع اور اخبار کا خیال میری عمر گیارہ سال کی تھی۔ ایک دن میرے والد مع چند دیگر اہل خاندان کے پاس بیٹھے ہوئے فرمارہے تھے کہ دیکھو لالہ چرنجی لال صاحب نے چھاپہ خانہ جاری کیا۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کا تذکرہ سیر الاولیاء چھاپا (لالہ صاحب موصوف بھی درگاہ حضرت محبوب الٰہی کے رہنے والے تھے) حالانکہ یہ کام ہم لوگوں کا تھا۔ یہ خدمت ہم انجام دیتے۔ کہ یہ ہمارا فرض تھا۔ دوسرے حضرات نے جواب دیا کہ یہ سب کام علم سے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں سے علم کا چرچا جاتا رہا تو لامحالہ اب دوسری قوم کے لوگ ہمارے مذہبی کام سے فائدہ اٹھائیں گے۔

میں نے یہ تقریر سنی اور اسی وقت دل میں عہد کیا کہ بڑا ہوکر میں چھاپہ خانہ جاری کروں گا اور ایسا کام کروں گا جس سے میرے ابا کا افسوس دور ہو جائے۔

اس مجلس میں لالہ امیر سنگھ صاحب ساکن بستی موصوف اور لالہ فقیر چند صاحب ساکن عرب سرائے (لالہ فقیر چند اور مولوی سید احمد صاحب مرحوم مولف فرہنگ آصفیہ

عرب سرائے کے باشندے اور اردو زبان کے ابتدائی اور بنیادی کام کرنے والوں میں تھے۔ ڈاکٹر فیلن کے ساتھ ان دونوں نے اردو لغت لکھنے کا بہت بڑا کام کیا تھا اب لالہ فقیر چند کے صاحبزادہ لالہ سری رام بھی باپ کے لائق بیٹے اور میرے دوست ہیں) کا ذکر آیا اور کسی اخبار یا رسالہ کا مذکور بھی ہوا۔ میں اخبار اور رسالہ کو تو نہیں سمجھ سکا لیکن یہ خیال ضرور کیا کہ جو چیز میرے بزرگوں کی نظر میں اچھی ہے اسکو میں ضرور کروں گا۔

گویا یہ پہلا تخم اخبار و مطبع کے شوق کا تھا جو کشت ذہن میں ڈالا گیا۔ پس بہائیوں کو بھی چاہیئے کہ اپنے بچے کے سامنے قوم کے ضروری مسایل کا ذکر کیا کریں تا کہ ان کو کام کرنے کا ابتدا سے شوق پیدا ہو۔

بہن کا وقت آخر

میں گیارہ برس کا تھا جب میری بہن حسن بانو نے بمرض فلج انتقال کیا۔ فلج کے بعد جب میں نے اپنی چاہنے والی بہن کو دیکھا جو پلنگ پر بے ہوش پڑی ہیں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ خود اس مرض میں مبتلا ہوں اور اس احساس کو آج تک نہیں بھولا ہوں۔

والدہ کا وقت آخر

بہن کی رحلت کے چار مہینے بعد والدہ بیمار ہوئیں اور انکا انتقال بھی ہو گیا۔ بہن کی جانکنی تو میں نے نہ دیکھی تھی والدہ کا مرنا تمام و کمال دیکھا۔ وہ مجھ سے کہتی تھیں مجھ پر پڑھ کر دم کرو۔ میں پڑھتا تو وہ فرماتیں لاحول پڑھو۔ لاحول پڑھو۔ شیطان میرے پاس آتا ہے۔ میں ایمان اسکو نہ دوں گی ان باتوں کو سن کر میرا کلیجہ دہلا جاتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیطان کو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔

جب ان کا سانس ختم ہو گیا۔ اور لوگ ان پر کپڑا ڈالنے لگے تب میں سمجھا کہ وہ مر گئیں۔ اور مجھے ان کی محبتیں یاد آنے لگیں۔

والد کا وقت آخر

والدہ کے ۴ مہینے کے بعد والد بیمار ہوئے۔ وہ ڈاکٹری علاج نہ کرتے

تھے۔ جب ان کو ڈاکٹری دوا پینے کے لئے مجبور کیا گیا تو انھوں نے فرمایا۔ آخر وقت میرا ایمان خراب نہ کرو۔

اس وقت میں سمجھا کہ ڈاکٹری دوا ایمان کے خلاف ہوتی ہو۔ اور برسوں میں نے بھی اسی خیال سے یہ دوا نہ پی۔

انتقال سے دو گھنٹہ پہلے کہ چار بجے رات کا وقت تھا والد نے مجھکو اور میرے بڑے بھائی کو پاس بلا کر فرمایا۔

"میرا وقت آخر ہے۔ اب تم میری جگہ غلام حسن خان صاحب ٹوہانوی کو سمجھنا (یہ بزرگ حضرت خواجہ شاہ اللہ بخش تونسوی کے خلیفہ اعظم اور میرے والد کے پرانے دوست ٹوہانہ ضلع حصار کے رہنے والے ہیں) اور بڑے بھائی سے کہا اپنے چھوٹے بھائی کی دلداری کرنا کہ اسکی ماں بھی زندہ نہیں ہیں۔

اس کے بعد فرمایا۔ میری دو باتیں یاد رکھنا۔ ایک تو یہ کہ اپنی محنت سے روزی کما کر کھانا۔ دوسرے یہ کہ ضمانت کسی کی نہ دینا۔ اگر خدا تم کو دے تو ضمانت چاہنے والے کو پانسو روپے ویسے دینا۔ مگر ضمانت کے نام سے پانچ کوڑیاں بھی نہ دینا۔ پھر فرمایا۔ مجھے پنجاب کے علاقہ سے مجاوری کافی آمدنی تھی۔ اور اس علاقہ کی نذریں اتنی آتی تھیں کہ میں روٹی سے بیفکر تھا مگر میں نے ساری عمر جلد سازی کر کے پیٹ پالا۔ میں نے تم کو حلال روزی سے پرورش کیا ہے۔ تم بھی اپنی محنت سے حلال روزی حاصل کرنا اور نذر و نیاز پر نہ رہنا۔ تم کو لوگ جلد ساز کا بیٹا کہیں تو برا نہ ماننا کہ یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ ہاں اگر تم کو کوڑیاں مانگنے والا درگاہ کا مجاور اور خادم کہیں تو تم کو شرمانا چاہیئے کہ تمہارے قدیمی بزرگوں کا یہ کام نہ تھا۔

جلد سازی کا پیشہ بہت اچھا پیشہ ہے۔ میں اس سے پانچ روپے روزانہ بھی کما لیتا تھا۔ اگر تم اسکو قائم رکھو تو بہت ہی اچھا۔ ورنہ اتنا پیشہ ضرور کرنا جس سے کھانے میں نمک حلال اور محنت کی روزی کا پڑے۔ اگر تم نمک حلال کا کھاؤ گے تو تمہاری باتیں تمہاری

علمیت میں اور تمہاری روحانیت میں اور ایمان میں ترقی ہوگی۔

اسکے بعد والد صاحب نے مجھ سے فرمایا جاؤ تم جاکر سو جاؤ۔ میں اٹھ کر چارپائی پر چلا گیا اور سو گیا۔ خواب میں دیکھا ایک روشنی میرے والد کے پلنگ سے بلند ہوکر املی کے درخت پر چلی گئی۔ جو مکان کے صحن میں تھا اور املی پر کچھ دیر گردش کرکے کہیں غائب ہوگئی۔ یہ خواب دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔ تو سنا کہ لوگ رو رہے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ جمعہ کا دن اور ۱۴ ربیع الاول ۱۳۰۸ھ کی تاریخ تھی۔

خانگی تکلیفات

والد ماجد کی رحلت کے بعد برادر مرحوم سید حسن علی شاہ نے مجھکو والدین سے زیادہ محبت و شفقت کے ساتھ پالنا شروع کیا۔ اور انہوں نے کوئی بات میری ولداری و دلجوئی کی باقی نہ رکھی۔ مگر وہ اپنی اہلیہ سے ابتدائی ایام میں کچھ مانوس نہ تھے۔ اور ان کی باہمی رنجشوں سے مجھکو بھی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی مثلاً یہ کہ وہ دونوں آپس میں کبیدہ ہوتے تو کھانا نہ کھاتے اور میں بھی ان کے سبب نہ کھاتا اور تعلیم کی محنت کے زمانہ میں کئی کئی وقت بھوکا رہنا مجھکو بہت کمزور کردیتا۔ یا بھائی سفر میں جاتے (جو اکثر جاتے تھے) تو مجھکو ان کی عدم موجودگی میں ناگفتہ بہ اذیتیں برداشت کرنی پڑتیں۔ اور اسوقت مجھکو والدین کی یاد ستاتی۔ اور میں آسمان کو دیکھکر ٹھنڈے سانس بھرتا اور اپنی والدہ کی قبر پر جاکر اور اسکو چمٹ کر زار و قطار رویا کرتا تھا۔

اس تکلیف جسمانی و روحانی سے مجھکو کئی سال سابقہ رہا۔ اور اس سے میری جسمانی ترقی رک گئی اور میں بہت کمزور و بیمار رہنے لگا۔

قصہ مختصر والدین کے بعد شادی تک میری زندگی ایسی پر الم و پرغم گزری کہ خدا کسی شخص کو وہ نصیب نہ کرے۔

ایک وجہ میری تکلیف کی خود میری صورت بھی تھی، میری شکل دیکھنے والوں کو شاید بہت اچھی معلوم ہوتی ہوگی۔ کہ بہت سے وعویدار اس کا اظہار مجھ سے کرتے تھے اور ہر روز

ایک نہ ایک نیا دعویدار ظاہر ہوتا تھا۔ بھائی مرحوم میرے باپ کی جگہ تھے۔ ان کا فرض تھا کہ مجھ کو برے اور آوارہ لوگوں سے بچاتے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی سختی سے بندشیں لگائی تھیں اور میں کسی شخص سے بات نہ کر سکتا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں بدچلن اور آوارہ صحبتوں سے قطعاً محفوظ رہا۔ تاہم اس سلسلہ میں بھائی صاحب کے اوہام اور غلط شکوک میرے لیے باعث اذیت ہوتے تھے۔ کہ وہ شریف اور نیک چلن آدمیوں کو بھی بدمعاش تصور کرتے تھے علانیہ ان کی توہین کر ڈالتے تھے۔

آج میں محسوس کرتا ہوں کہ اولاد اور ماتحت بچوں کی نگرانی کے لیے یہ سخت طریقہ مناسب نہیں ہے اور نہ وہ بے پروائی مناسب ہے جو اکثر والدین کرتے ہیں۔ اور اس کے سبب ان کے بچے آوارہ صحبتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ حکمت عملی اور نرمی سے ان اسباب کو دفع کیا جائے جو مضر معلوم ہوں۔ اور بچوں کو بہت موزوں اور ملائم طریقے کے ساتھ بد اطوار لوگوں سے بچایا جائے۔ سخت بازپرس اور علانیہ غیظ و غضب سے بچے بے راہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو ایک طرح کی ضد اپنے بڑوں سے ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنے بھائی کی اطاعت سے ان معاملات میں کبھی سرتابی نہیں کی۔ البتہ منشی غلام نظام الدین صاحب تاجر کتب دہلی (جواب بھی موجود ہیں) اور حافظ عبدالغنی مرحوم تاجر جنت دہلی کے ملنے میں میں نے بھائی صاحب مرحوم کا بہت کم کہنا مانا کیونکہ میں ان دونوں کو پاکباز۔ اور اپنا بہت ہی خیرخواہ مخلص دیکھتا تھا۔ چنانچہ منشی غلام نظام الدین صاحب نے آج تک وہی تعلق قائم رکھا ہے۔ اور اپنی ہمدردی کو ایک ذرہ کی برابر بھی کم نہیں کیا۔ اور میں علی الاعلان اقرار کر چکا ہوں اور کرتا ہوں کہ لکھنے پڑھنے اور دنیا میں قومی کام کرنے کی ترغیب دلانے والے۔ اور پھر قدم بقدم آگے بڑھانے والے یہی بزرگ ہیں۔ جنہوں نے میرے باعث مرحوم بھائی کے بڑے بڑے جور برداشت کیے ہیں

اور میں نے بھی ان کے ملنے اور ان کے مشوروں پر چلنے کے سبب ناقابل بیان اذیتیں اٹھائی ہیں۔

منشی غلام نظام الدین صاحب

عرف خاکسار عالم جنکی تجارت کتب کی دکان دریبہ کلاں میں ہے ایک مستند اور شریف ہندو خاندان سے ہیں۔ ابتدائی عمر میں اپنے شوق سے مسلمان ہوئے اور غلام نظام الدین نام رکھا انکو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الہیؒ سے بہت عقیدت و محبت تھی اور انکے مزار پر ہر بدھ کو دہلی سے حاضر ہوتے تھے۔ اور شاید ۴۰ برس تک ایک بدھ بھی انہوں نے ناغہ نہیں کیا میں تیرہ سال کی عمر سے انکو درگاہ شریف میں حاضر ہوتے دیکھتا تھا لیکن وہ اس سے بھی سالہا سال پیشتر کے حاضر باشوں میں اس درگاہ کے تھے۔ لالہ پیارے لال جوہری جن کو ہم بچپن میں بدھ والہ لالہ کہتے تھے اور ان خاکسار عالم صاحب کی پابند حاضری سب لوگوں میں ضرب المثل بن گئی تھی۔ خاکسار صاحب کا دستور تھا کہ پہلے درگاہ کی باؤلی میں غسل کرتے تھے پھر اندر حاضر ہوتے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ ان کو شدت کا بخار چڑھا ہوا ہے اور وہ اپنی وضعداری کے خیال سے اور حسن عقیدت کے جوش سے باؤلی میں نہا رہے ہیں میں نے سنا کہ ایک دفعہ ان کے لڑکے کا انتقال ہوگیا مگر انہوں نے فرزند کی تجہیز و تکفین سے پہلے بدھ کی حاضری کو پورا کیا اور واپس آکر جوان لڑکے کو اوّل منزل پہنچایا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت کی صداقت کا اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

خاکسار صاحب نے شروع شروع میں مجھکو دیکھا تو یہ کہا کہ میاں پیرزادگی کا گھمنڈ بہت بری چیز ہے جس نے اپنے آپ کو کچھ سمجھا وہ کچھ نہ رہا جس نے کچھ نہ سمجھا وہ سب کچھ ہو گیا۔

میں نے انکی بات کو غور سے سنا۔ اگرچہ یہ فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں مگر ان سے دل کو لگاؤ ہو گیا اور جب بدھ کو وہ آتے تو میں کچھ دیر انکی باتیں سنتا اور انکے پاس بیٹھتا۔

خاکسار صاحب حضرت شاہ غلام حسن خان صاحب ٹوہانوی کے مرید تھے اور ٹوہانوی صاحب وہ بزرگ ہیں جن کا ذکر ابھی لکھا گیا کہ میرے والد نے ان کی اطاعت کی وصیت فرمائی

تھی۔ اسواسطے خاکسار صاحب بھی سلسلہ سلیمانیہ تونسویہ کے دیگر مریدین کی طرح میرے بھائی کے دائرہ حکومت میں تھے (درگاہ میں وکالت کا جو دستور ہے اس کی طرف لفظ حکومت میں اشارہ ہے) اور خاکسار صاحب کے مجھ سے ملنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ مگر مرحوم بھائی صاحب کو ان کی متعلق بھی شکوک پیدا ہوئے اور انہوں نے مجھ کو حکم دیا کہ میں خاکسار سے نہ ملوں نہ ان سے بات کروں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ مجھ کو نیک نصیحت کرتے ہیں اور نیک بننے کے مشورے دیتے ہیں وہ بہت اچھے آدمی ہیں آپ انکو برا نہ سمجھئے۔

بھائی صاحب اس جواب سے سخت برہم ہوئے اور انہوں نے خاکسار صاحب کو حکم دیا کہ میرے بھائی سے بات نہ کیا کرو۔ انہوں نے جواب دیا۔ اپنے بھائی کو منع کیجئے وہ مجھ سے نہ ملیں گے تو میں بھی نہ ملوں گا اور وہ ملیں گے تو میں ملنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

غرض یہ بات بہت بڑھ گئی اور ناگوار ہونے نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ مجھ پر ناقابل برداشت جبر کئے گئے مگر میں نے کچھ پروا نہ کی اور خاکسار صاحب سے علانیہ ملتا رہا۔

اب خاکسار صاحب نے بدھ کی حاضری کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی درگاہ میں آکر پڑھنی شروع کی۔ اور مجھ کو ہفتہ میں دو بار ان سے ملنے اور انکی نصیحتوں کو سننے کا موقع ملنے لگا۔ انکی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ میری ۲۵ سال کی عمر تک انہوں نے مجھ سے مصافحہ بھی نہیں کیا۔ جو طریق مسنون ہے اس پاک بازی کے باوجود افسوس ہے کہ ان پر نارواشکوک کئے جاتے تھے۔

خاکسار نے مجھ کو ساری دنیا کے نشیب و فراز بتائے اور کہا کہ تم کو علم عربی مکمل کرنا۔ اور اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے اور وہ ترک طمع اور عبادت حق ہے انکی صحبت میں نے درگاہ والوں کی موجودہ روش کے خلاف وعظ سنا۔ وہ کہتے تھے کہ جو پیرزادے خود کچھ عمل نہیں کرتے اور صرف اپنے بڑوں کی کرامتیں سنا کر روزی پیدا کرتے ہیں انکی زندگی قابل فخر نہیں بلکہ قابل ملامت ہے۔ تم ایسے نہ رہو بلکہ عمل کرو اور جن کے ناموں کے ہم سب غلام ہیں انہی کے کام اختیار کرو۔ انکا کام نذر و نیاز مانگنا اور فحش کلامی

ہیں رات دن مصروف رہنا اور حسد و کینہ کی غرق آبی نہ تھی جو آجکل کے پیرزادوں میں دیکھی ہو۔

خاکسار صاحب نے مجکو دینی اور بشری نصیحتوں کے علاوہ دُنیا اور معاش حاصل کرنیکے بھی راستہ بتائے۔ اور تجارت و محنت سے روزی پیدا کرنے پر مائل کیا انکی دُکان کتابونکی تھی۔ وہ میرے پاس مولانا شرر کے ناول لاتے اور کہتے کہ ایسی عبارت لکھنے کی مشق کرو جب یہ آجائیگی تو روزی آسانی سے کمانے لگو گے اور درگاہ کی آمدنی کی پرواہ تم کو نہ رہے گی۔

قصہ مختصر تیرہ چودہ سال کی عمر سے لیکر آج ۴۱ سال کی عمر تک انہوں نے میری ہر اچھی بری حالت میں قدم سے۔ زبان سے۔ مال سے مدد کی اور ترقی کے ہر زینہ پر ہاتھ پکڑے ہوئے ساتھ رہے اور ساتھ ہیں۔ اور خدا کرے مدتوں ساتھ رہیں۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں نے واقعی دین دنیا میں کچھ ترقی کی ہے تو یہ اسی بزرگ اور خضر سیرت شخص کا طفیل ہے جو دریبہ کلاں میں کتابوں کی دُکان پر بیٹھا ہے۔ جسکی بینائی نے جواب دیدیا ہے۔ جس کے جسم پر کمبل کا میلا اور دریدہ لباس ہے جس کے ناخن بہت بڑھے ہوئے ہیں اور جو اپنے گاہکوں سے بہت ترش روئی سے بات کر رہا ہے کیونکہ وہ ایک سچی قیمت کہتا ہے اور جب گاہک کمی بیشی کرنی چاہتے ہیں جسکی ان سب کو عادت ہے تو وہ خفا ہوتا ہے اور ترش برتاؤ کرتا ہے۔ وہ جو بہت دراز قد ہے وہ جو گندمی رنگت رکھتا ہے۔ وہ جسکی ڈاڑھی اور لبیں بڑھی ہوئی ہیں۔ جو پانچ وقت کی نماز کے علاوہ خبر نہیں کتنی زیادہ نمازیں اور کتنے زیادہ وظائف پڑھتا ہے جو درگاہوں اور ۶۰ سو نکی حاضری باوجود کبر سنی اور بینائی کی کمزوری کے کبھی ناغہ نہیں کرتا۔ انہی کا نام غلام نظام الدین ہے انہی کو خاکسار کہتے ہیں۔ یہی وہ ہیں جن کو نہ عربی کا علم ہے نہ فارسی کا۔ انگریزی جانتے ہیں نہ اچھی اُردو مگر دانشمندی کا یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان جوق جوق ان کے پاس اپنے اُلجھے ہوئے خانگی قصوں کی نسبت رائے لینے آتے ہیں۔ اور یہ گردن جھکائے جھکائے دو باتوں میں ایک سلجھاؤ کی صورت بنا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندو انکو قطب اور ولی سمجھتے ہیں اور انکے اقوال سے شگون لیتے ہیں

خاکسار صاحب کی وضعداری کا یہ حال ہے کہ میری ابتدائی ملاقات کے ایام میں دو پیسے کے پان میرے لیئے لایا کرتے تھے۔ وہ رسم انکی آج تک جاری ہے۔ شادی ہوگئی تو میری بیوی کو یہ پان بھیجتے رہے۔ انکا انتقال ہوگیا تو میری لڑکی کے ساتھ یہ وضع جاری رہی اور اب میری دوسری بیوی کو پان بھیجے جاتے ہیں۔

میرے ہی ساتھ نہیں بلکہ جنکو میں دوست رکھتا ہوں ان کے دکھ درد کے بھی ایسے ہی شریک ہیں گویا وہ انہی کے ملنے والے ہیں۔ چنانچہ واحدی صاحب۔ اور اڈیٹر صاحب اسوۂ حسنہ اور دیگر چند احباب کے ساتھ ان کا یہی برتاؤ ہے۔ اور یہ احباب بھی میری طرح انکو اپنا بزرگ جانتے ہیں۔ اور ان کے مشورہ بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

خاکسار صاحب کی اس سرسری سرگذشت سنانے کے بعد مجھے اپنے مرحوم بھائی کا احسان بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے بدچلن زمانہ سے میری جس قدر حفاظت کی یہ ان کا فرض تھا۔ اور اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اور میں کسی خراب صحبت میں مبتلا نہو سکا خاکسار صاحب کی نسبت ان کی بدظنی رائے کی غلطی تھی مگر نیت کی کجی نہ تھی۔

حافظ عبد المغنی صاحب

خاکسار صاحب کے ابتدائی بیان میں حافظ عبد المغنی صاحب کا نام آیا ہے۔ وہ چوڑی والوں کے محلہ میں رہتے تھے اور حافظ نصیر الدین صاحب بڑے مشہور تاجر جُفت کے فرزند تھے۔ حافظ نصیر الدین صاحب ایک مرد کامل اور ولی اللہ بزرگ تھے تجارت جُفت آخر میں ترک کردی تھی۔ انکے صاحبزادے حافظ صاحب موصوف بھی بہت نیک چلن اور اللہ والے تارک دنیا شخص تھے وہ بھی خاکسار صاحب کیساتھ مجھ سے ملتے تھے ان کو میرے ساتھ دعوائے عشق تھا۔ مگر وہ مغلوب الغضب بہت تھے اور بھائی صاحب کی مخالفت سے بہت جلد افروختہ ہوجاتے تھے۔ ایک روز انہوں نے میرے بھائی کو پس پشت کچھ بُرا کہا۔ میں نے بھائی کی حمایت کی اور ان کو سمجھایا کہ وہ میرے سرپرست ہیں ان کی احتیاط حق بجانب ہے اس پر حافظ صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے کہا محبت سب سے بڑی ہے۔ میں نے کہا

میں محبت سے واقف نہیں ہوں نہ مجھے موجودہ تعلیمی مصروفیت کے سبب محبت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حافظ صاحب اس کلام سے مشتعل ہو کر چلے گئے اور چند روز کے بعد سنا گیا کہ انہوں نے گندک کا تیزاب پی لیا جس سے ان کو فوراً خون کی قے آنے لگی۔ انکے قرابت داروں اور والد کو خبر ہوئی ڈاکٹری امداد اسی وقت مہیا ہو گئی مگر وہ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہے اور انتقال کر گئے۔ انکی قبر درگاہ شریف کے لنگر خانہ کے پاس بنائی گئی۔

تھیٹر کا شوق

میں پندرہ سال کا تھا دہلی میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی تھی اور اسکا بہت چرچا ہوا تھا یہاں تک کہ سقوں نے اپنی مشکیں اور دھوبیوں نے اپنے بیل فروخت کر کے اس کمپنی کا تماشہ دیکھا تھا۔

اس کمپنی کے مالک درگاہ میں آئے تو کچھ مفت کے ٹکٹ دے گئے میں بھی درگاہ والوں کے ساتھ یہ مفت کا تماشہ دیکھنے گیا۔

پہلا تماشہ دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری عقل کا ذرا سا حصہ بھی باقی نہ تھا اور سب پر تماشہ کا طلسم مسلط ہو گیا تھا۔ آدھی رات کو میری آنکھ کھلتی تو میرے کان گانا سنتے اور ان میں ہو بہو ایکٹروں کی آوازیں آتیں (اس بیان میں شائد عقلمندوں کو مبالغہ معلوم ہو گا مگر یہ بالکل سچا بیان ہے اور اس میں ایک حرف کی بھی زیادتی نہیں ہے) حالانکہ اسوقت میں اپنے گھر کے اندر اپنی چارپائی پر پڑا ہوتا تھا۔ دن کے وقت ہر اجنبی آدمی کو میں تماشہ والا جانتا اور سمجھتا اور تماشے کا منظر میری آنکھوں سے جدا نہ ہوتا۔

کھانا پینا۔ سونا۔ پڑھنا سب زہر معلوم ہوتا تھا۔ اور تماشہ کے سوا کسی چیز کا خیال نہ آتا تھا۔ مگر میرے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا جو دوبارہ ٹکٹ لیکر تماشہ دیکھتا۔

اسی زمانہ میں ایک شخص نے درگاہ کی نذر کے مجھکو تین روپیہ دیئے جن سے میں نے بارہ راتیں مسلسل تماشہ دیکھا۔ اس زمانہ میں ایک عمل پڑھنے کا شوق تھا۔ اور اس کے سبب رات کو درگاہ میں سوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھا کر میں درگاہ میں آتا اور وہاں سے

چپ چاپ چار میل طے کرکے دہلی پہنچتا۔ چار آنہ کا ٹکٹ لیکر تماشہ دیکھتا اور پھر رات کو ۲ بجے جنگل بیابان اور ڈراؤنے راستہ سے گزر کر چار میل کی مکرر مسافت پیدل طے کرکے درگاہ آتا اور سو جاتا۔ عمل پڑھنا رفوچکر ہوگیا اور تھیٹر کی تکان کے سبب ہر وقت میری آنکھیں سرخ اور خمار آلود رہتی تھیں اور لوگ سمجھتے کہ میں عبادت اور شب بیداری میں مصروف رہتا ہوں اور بھائی سمیت سب گھر والے میرے بہت معتقد ہوگئے تھے۔

بارہ رات کی تکان نے بیمار ڈال دیا اور مہینوں کی بیماری کے بعد میرا یہ نشہ ذرا کم ہوا گو اس کے بعد بھی برسوں یہ شوق جاری رہا لیکن وہ بے عقلی و خود فراموشی کی حالت نہ تھی۔

آج میں اس واقعہ کے تجربہ سے اپنے پیر بھائیوں کو نصیحت کر سکتا ہوں کہ اپنے نوعمر بچوں کو تماشہ ہرگز نہ دکھائیں یعنی تھیٹر نہ جانے دیں ورنہ یہ بلا انکو پڑھنے لکھنے سے کھو دے گی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ڈرامے اور تھیٹر کے تماشے عقل، مشاہدہ اور تجربہ بڑھاتے ہیں مگر علم اور سمجھ حاصل ہونے کے بعد (جو تیس برس سے پہلے عموماً حاصل نہیں ہوتی) تماشہ دیکھنا مفید ہوتا ہے اس سے پہلے زہر ہے بلا ہے۔ اور ہلاک کرنیوالا مرض ہے۔

اخبار کا شوق

میری عمر شاید سولہ برس سے کچھ ہی زیادہ ہوگی مولوی برکت اللہ صاحب کشتہ پوسٹ ماسٹر عرب سرائے نے مجھ کو اخبار ہمدرد مراد آباد کا ایک پرچہ دیا۔ اور کہا اس کو دیکھو۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے بولے اخبار ہے میں نہیں جانتا تھا اخبار کیا ہوتا ہے میں نے اس کو پڑھا اور میرا جی اس میں بہت لگا۔ اسکے بعد میں نے حامد الاخبار مراد آباد و انڈیا گزٹ بمبئی اور افضل الاخبار دہلی پرچے خرید کر اپنے نام جاری کرائے اور پڑھتے پڑھتے مجھکو لکھنے کا شوق ہوا۔

سب سے پہلا مضمون

انڈیا گزٹ بمبئی میں انڈیا کی نازک حالت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو اصلاح کے بعد شایع ہوگیا۔

اس مضمون کے شائع ہونے سے مجھ کو اسقدر خوشی ہوئی جسکا اظہار

ناممکن ہے مگر بڑے بھائی صاحب نہایت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس مشغلہ کو بہت برا سمجھا اس لیئے میں چپکے چپکے مضامین لکھنے لگا۔

ایک دن جناب میر ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی جو حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار ہیں (جناب فراق بڑے قادر الکلام شاعر بزرگ صفت اہل دل۔ اور پابند وضع شخص ہیں ان کے مضامین رسالوں میں بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں) میرے بزرگوں سے ان کے بزرگوں کے تعلقات رہتے آئے ہیں۔ بھائی مرحوم سے ان کی بہت دوستی تھی۔ درگاہ میں تشریف لائے اور ان کے سامنے بھائی نے مضامین نویسی کا ذکر کیا تو انہوں نے بھائی صاحب کو بہت ڈرایا اور کہا یہ کام بہت مخدوش ہے ایسا نہ ہو کوئی الٹا سیدھا مضمون لکھدیں اور اس سے مقدمہ قائم ہو جائے اس کے ساتھ ہی اپنی مضمون نگاری اور ایک لائبل کیس کا ذکر بھی کیا۔

فراق صاحب کا یہ کہنا عین دوستی اور خلوص پر مبنی تھا مگر میرے لیئے وہ قیامت ہو گیا اور بھائی صاحب نے نہایت سختی مضامین لکھنے کے خلاف کرنی شروع کی۔

خاکسار صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھ کو سہارا دیا اور کہا ابھی اخبار وغیرہ نہ لکھو۔ بلکہ کتابیں لکھنی شروع کرو اس میں کچھ خطرہ نہیں ہے چنانچہ میں نے مولانا شرر کی تقلید میں ایک ناول لکھا جس کا مضمون مجھے یاد نہیں کہ کیا لکھا تھا۔ لکھنؤ کے ایک کتاب فروش عبدالجبار خان (یا اسی کے قریب کچھ نام تھا) مجھکو خیرآباد کے عرس میں ملے اور انہوں نے اس ناول کا ذکر سنکر کہا کہ مجھ کو وہ ناول ڈاک کے ذریعے بھیجدو۔ میں اسکو شائع کر دوں گا میں نے دہلی آکر خوشی خوشی ناول ان کو بھیجدیا۔ آٹھ دن کے بعد خط آیا کہ یہ ناول تو یہاں کسی کو بھی پسند نہیں آیا۔ ہم اس کو نہیں چھاپ سکتے۔

اس اطلاع سے میری ہمت ٹوٹ گئی اور میں نے لکھنے کا مشغلہ ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا خاکسار صاحب سے ذکر آیا تو ہنسے۔ اور انہوں نے کہا ابھی سے گھبرا گئے شروع

شروع میں یہی ہوا کرتا ہے۔ہمت نہ ہارو۔برابر لکھتے رہو ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ تمہاری تحریر منگانے کو بے قرار ہوں گے اور تم ان کو ایسے ہی روکھے جواب دو گے جیسا کہ لکھنوی کتاب فروش نے تم کو جواب دیا ہے۔

میں نے پھر لکھنا شروع کیا اور پیسہ اخبار وغیرہ میں میرے مضامین شائع ہونے لگے۔اور اسکے بعد وکیل امرتسر وغیرہ مستند و محتاط اخباروں نے بھی میری تحریریں چھاپنی شروع کردیں۔

سفلی اعمال کا شوق

اسی زمانہ میں مجھکو تسخیر ہمزاد۔مسمریزم۔اور سفلی عملیات کا شوق پیدا ہوا۔اور ان کے حصول میں ہر قسم کی محنتیں اور جستجو کرنے لگا۔ہمزاد کے متعدد طریقے آزمائے اور ان میں بڑی بڑی ناہنجار و نامناسب ریاضتیں کی گئیں۔اگرچہ ایک حد تک اس جفاکشی کا صلہ حاصل ہوا تاہم محنت وشاقہ اور اوقات عزیز کے خرچ کے مقابلہ میں وہ بالکل ہیچ اور ناکافی تھا۔

البتہ مسمریزم کی مشق بڑھنے سے مجھ میں سلب مرض کی ایک غیر معمولی قوت پیدا ہوگئی۔اعصابی امراض اور خیالی و وہمی علالتیں پانچ منٹ کے اندر دور کردیتا تھا دق کے بعض مایوس بیماروں کا بھی حیرت خیز علاج کیا اور وہ اچھے ہوگئے۔حافظ محمد عمر مرحوم چاندی والے ساکن کوچہ استاد حامد دہلی کی اہلیہ دق کی آخری حد میں پہنچ گئی تھیں اور انگریزی و یونانی اطبا نے جواب دیدیا تھا۔میں نے صرف تین دن مسمریزم کے طریق سلب سے انکا علاج کیا۔اور وہ اچھی ہوگئیں اور اب تک موجود ہیں گو ان کے شوہر سابق کا انتقال ہوچکا ہے جنکی خاطر سے میں نے یہ علاج کیا تھا۔حافظ صاحب کے اس واقعہ سے غلغلہ مچ گیا اور ہزاروں بیمار میرے پاس آنے لگے۔یہانتک کہ ایک مریض دق کے سلب مرض کے سبب میں خود دق میں مبتلا ہوگیا اور بہزار دقت و پریشانی اچھا ہوا۔جب سے میں نے سلب کا علاج ترک کردیا۔

آشوب چشم کے علاج میں تو میرا مسمریزم عجیب کرشمہ دکھاتا تھا جہاں میں نے تین بار

آنکھوں کا اپنے ہاتھوں سے مس کیا۔ اور آشوب دور ہوا۔ ایک منٹ کی دیر بھی نہ لگتی تھی، مگر میں خود وقت میں مبتلا ہوا تو یہ تمام معالجات ترک کر دیئے۔

سفلی اعمال کا کوئی بدتر سے بدتر طریقہ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ اور اس غلیظ کوچہ کی ہر گلی کو دیکھا لیکن جب توبہ کی تو پھر اسکے خیال کو بھی پاس نہ آنے دیا۔

پیر بھائیوں کو اپنے تجربہ کی بنا پر نصیحت کرتا ہوں کہ وہ عملیات سفلی ہوں یا علوی۔ ہمزاد ہو یا اور کوئی مؤکلات کا عمل انمیں کسی کا شوق بھی پیدا نہ کریں۔ یہ بالکل فضول اور احمقانہ خبط ہیں۔ اور ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ انسان وقت دولت اور صحت برباد کر دیتا ہے۔

اسباب ظاہری کی سعی بہت صاف اور سفید عمل ہے کوئی ہنر سیکھو۔ کوئی علم حاصل کرو۔ کوئی تجارت کر کے دیکھو کہ اسمیں دونوں جہان کا فائدہ ہے۔ اور ان عملیات میں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض دنیا کی بے عقلی کا ایک بہاؤ ہے۔ کہ جس طرف بہت سے بے وقوف بہتے ہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی بہنے لگتے ہیں۔

البتہ مسمریزم اور اسکے دیگر ترقی یافتہ طریقے کچھ کارآمد ہیں۔ خیال اور نظر کی قوت جمع کر کے یہ کھیل تھوڑا سا کام دینے لگتا ہے۔ مگر عموماً یہ بھی ایک طرح کا تماشا ہے اور شعبدوں بازی کا کھلونا ہے۔ خدا کی یاد اور اشغال صوفیہ سے جو قوت خیال کو اور نظر کو حاصل ہوتی ہے وہ مسمریزم سے لاکھوں درجہ بڑھ کر ہے۔

مجھے کیمیا کا شوق کبھی نہیں ہوا۔ حالانکہ میرے دادا۔ میرے والد۔ اور میرے بھائی کو اس کا بہت ذوق تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وقت ضائع کرنے اور دولت کھونے کا ایک جنون ہے۔ اور اس کا شوق کچھ بھی مفید نہیں ہے کیمیاگروں کو البتہ کشتے پھونکنے آجاتے ہیں لیکن یہ قابلیت بہت عرصہ کے بعد ہوتی ہے اور لاکھوں کروڑوں روپیہ کا قیمتی وقت برباد اور ضائع کرنے کے بعد یہ قابلیت کچھ زیادہ قیمتی ثابت نہیں ہوتی۔

شادی اور رسومات کا جھگڑا

اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی ہوئی۔ اسوقت میں نیا نیا گنگوہ سے پڑھ کر آیا تھا اور مراسم شادی کے خلاف وعظ کہنے کا مجکو بہت شوق تھا۔ اپنی شادی کے وقت بھی میں نے بڑی حجت بازیاں کیں۔ اور رسوم بدعت کو روکنا چاہا مگر بھائی اور خاندان کے سامنے میری کچھ نہ چل سکی اور سوائے چند خاص و قبیح مراسم کے ترک کے باقی سب مجکو کرنی پڑیں۔

شادی کے بعد میری زوجہ کے بھائی اور میرے بھائی میں کچھ اس قسم کے جھگڑے پڑے کہ میری بیوی ایک سال اپنے میکہ میں بیٹھی رہیں۔

لیکن جب تاکسار صاحب کے مشورے و اعانت سے میں نے بھائی سے علیحدہ رہنے کا تہیہ کرلیا۔ تو میری بیوی میکہ سے آگئیں۔ اور میں ان کے ساتھ ایک علیحدہ مکان میں رہنے لگا۔ اور گھر داری کے خرچ کا یکایک ایک بوجھ مجھ پر آن پڑا۔ جس کے سبب ابتدا میں بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوا کیونکہ میں نے ایک طرف تو درگاہ کے طریقہ معاش کو ترک کردیا تھا اور دوسری طرف بھائی سے جدا ہونے کے باعث انکی امداد بھی لینی چھوڑدی تھی۔

عمارات دہلی کے نقشے اور کتابیں فروخت کرنے کو دہلی سے باہر جاتا اور کبھی درگاہ کے زائرین کے ہاتھ فروخت کرتا۔ اور اس طرح بمشکل دو آدمیوں کا خرچ نکلتا۔ اور کبھی کچھ نہ ہوتا تو ہم دونوں فاقے سے بسر اوقات کرتے۔

خدا جنت نصیب کرے میرے مرحوم بھائی کو کہ وہ الگ ہونے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً مدد کرتے تھے۔ جسکو کبھی میں لے لیتا تھا اور کبھی نہ لیتا۔

تعزیہ کی مخالفت

درگاہ کی طرف سے ایک تعزیہ بنا کرتا ہے۔ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب مکان پر آیا تو تعزیہ کے خلاف تقریریں کرنے لگا۔ اور اسکو بت پرستی سمجھ کر شد و مد سے اسکی مخالفت شروع کی۔ کچھ نوجوان میرے ہم خیال ہوگئے اور باقی تمام خاندان دشمن ہوگیا اس جدوجہد میں کبھی مجکو سخت

امتحان دینے پڑے۔ اور پولس تک نوبتیں پہونچیں۔

مگر شادی ہونے کے بعد میری زندگی کا جوش و خروش اعتدال پر آگیا۔ اور ناتجربہ کار رند کی طرح بے محابہ باتیں کرنی میں نے چھوڑ دیں۔ گو تعزیہ کو اب بھی ناجائز اور مسلمانوں کے مسلک توحید کے سراسر خلاف سمجھتا ہوں۔

حکام انگریزی سے میل جول

خاکسار صاحب کے مشورہ سے شادی کے بعد میں نے دہلی کے انگریزی حکام سے ملنا جلنا شروع کیا۔ اور بہت جلدی انمیں میرا اثر و رسوخ بڑھا۔ کہ لارڈ کرزن تک رسائی ہو گئی لارڈ کرزن بعض اوقات اپنے ہاتھ سے مجھ کو خط لکھتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد لارڈ منٹو سے گورنمنٹ ہوس کلکتہ میں ملاقات ہوئی اور لاٹوش صاحب لفٹننٹ گورنر (یو۔ پی) سے بھی رسم پیدا ہوئی۔ اور وہ بھی اپنے ہاتھ سے دوستانہ خطوط لکھنے لگے۔

حکام دہلی کی عنایت کے سبب پرنس آف ویلز (جو آج کل کنگ جارج ہیں) سے بھی ملاقات ہوئی۔ جبکہ وہ درگاہ کی زیارت کو آئے تھے۔ اور امیر حبیب اللہ خان صاحب بادشاہ کابل نے بھی ملاقات کا بے تکلفانہ موقع دیا۔

ہندوں کے تیرتھوں کی سیر

سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۶ء میں خاکسار صاحب کی ہدایت نے ہندو فقراء سے ملنے اور ہندو تیرتھ گاہوں کی سیر کرنے کا شوق دلایا۔ دہلی سے چلکر پہلے متھرا اور بندرابن میں قیام رہا اور عرصہ تک وہاں کے مشہور فقراء کی خدمت میں حاضری دی۔ اس سفر میں ایک کمبل۔ ایک جھولی۔ اور ایک رنگین لنگی کرتے کے سوا میرے پاس کچھ سامان نہ تھا۔

متھرا سے اجودھیا۔ بنارس۔ گیا۔ بدھ گیا۔ ہردوار۔ رکھی کیش وغیرہ جانا ہوا۔ اور یہاں

کے مشہور مندروں کو دیکھا اور بعض فقرا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طولانی سفر کے حالات بعض رسائل میں متفرق طور سے کبھی کبھی شائع کرائے۔ مگر وہ اتنے زیادہ اور عجیب تھے کہ ایک مستقل رسالہ سیر کتابیں اس کے نام سے لکھا۔ یہ رسالہ چھپ جاتا تو اس زندگی اور سیر کا بڑا موثر نظارہ دکھاتا۔ لیکن ۱۹۰۸ء کی شدید مخالفتوں نے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اس کے شائع کرنے سے باز رکھا کیونکہ اسی سفر کو خاندانی مخالفین نے عداوت نکالنے اور عوام کو بھڑکانے اور بدگمان کرنے کا حیلہ قرار دیا تھا۔ کافر ہندو اور بت پرست کے خطابات اسی سیاحت نے دلوائے تھے۔

اب کبھی فرصت ہوگی تو پرانے کاغذات میں اس رسالہ کو تلاش کر کے چھاپ دیا جائے گا۔ کیونکہ آجکل خدا کے فضل سے تعصبات کا وہ زور نہیں ہے۔

قلم و بخشش غالباً

اسی زمانہ میں ایک عرصہ تک اخبار وکیل امرتسر کے دفتر میں قیام رہا۔ اور جب ہی پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ دیکھا۔ وکیل آفس کے ایام قیام میں پہلی مرتبہ مولانا ابو النصر آہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابو الکلام آزاد سے ملاقات ہوئی اور حافظ عبد الرحمٰن مرحوم سیاح ممالک اسلامیہ سے بھی ہم نشینی رہی۔

اخبار وکیل امرتسر کے مالک و بانی شیخ غلام محمد مرحوم کی اس چند روزہ صحبت نے اخلاق و عادات اور ضروریات قوم سے آگاہ کر کے طرح طرح کے ذاتی تجربے سکھائے خصوصاً شیخ غلام محمد مرحوم کے اخلاص و صداقت نے جو سارے پنجاب کے اخبار نویسوں میں ممتاز شان رکھتی تھی دنیا میں تحریری خدمت قوم کا ایک راستہ بتایا۔

پنجاب کا تیسرا سفر

والد مرحوم اور بھائی مرحوم کے ہمراہ پنجاب کے دو سفر خردسالی میں کیے تھے۔ تیسرا سفر حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری پھلواروی کی ہمراہی میں بھاولپور کا ہوا جبکہ وہاں نواب مرحوم کی مسند نشینی کا جشن تھا (نواب مرحوم سے مراد موجودہ نواب صاحب کے والد صاحب ہیں) حضرت

مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی مجھ سے اپنے فرزند کی طرح محبت رکھتے تھے اور قومی جلسوں کا تعارف سب سے پہلے انہوں نے کرایا تھا۔ چنانچہ اس سفر بہاولپور کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ جلسہ منعقدہ بمبئی میں وہی مجکو اپنے ہمراہ لے گئے تھے اور انہیں کی معیت میں اسی سال مدراس کے جلسہ ندوۃ العلماء میں شرکت ہوئی تھی حضرت شاہ صاحب کے مجھ پر اتنے کثیر احسانات ہیں جنکو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

سفر بہاولپور میں سب سے پہلی بار شیخ عبد القادر صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں اخبار وا سٹیچ کے آفتاب بنے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے مجکو دیکھکر کہا کہ شیخ محمد اقبال صاحب کا خیال تھا کہ حسن نظامی بہت بڑے آدمی ہیں اور میں کہتا تھا کہ وہ نوعمر ہیں۔ آج دیکھ کر مجکو اپنے اندازہ کی تصدیق ہو گئی کہ وہ صحیح تھا۔

اس سفر کے بعد چوتھا سفر پنجاب کا وہ تھا جس کا ذکر ابھی کیا گیا اور امرتسر میں زیادہ قیام ہوا تھا۔ اس سفر میں شیخ محمد اقبال صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور پنجاب کے قومی خیالات کا ایک گہرا اثر لے کر دہلی واپس آیا۔

میرزا قادیانی کی ملاقات

امرتسر کے اسی زمانہ قیام میں قادیان کا سفر بھی ہوا اور میرزا غلام احمد صاحب و حکیم نور الدین صاحب اور مولوی عبد الکریم صاحب اور مولوی محمد علی صاحب وغیرہ بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں مگر میرزا صاحب کا کچھ اچھا اثر مجھ پر نہ پڑا۔

مولانا شبلی

مولانا ابو الکلام۔ تیرتھ یاترا کے زمانہ میں چندروز مسلسل لکھنؤ میں مولانا ابو الکلام کے ہمراہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس زمانہ میں رسالہ الندوۃ کے ایڈیٹر تھے اور دار العلوم ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج کے ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ میں انہی کے کمرہ میں ان کے ساتھ عرصہ تک ٹھیرا رہا۔ اور مولانا شبلی مرحوم کی صحبتوں سے فیض اٹھائے مولانا سید سلیمان ایڈیٹر رسالہ معارف اس زمانہ میں کم سن اور طالب علم تھے۔

اسی زمانہ سے میری اور مولانا ابوالکلام کی بہت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی ۔

رزق کی تنگی

کے اس عہد میں ایک دفعہ بہاولپور جانا ہوا ۔ جو دہلی کے چند اخبار نویس دوستوں کی تحریک سے ہوا تھا ۔ بہاولپور میں نواب صاحب کی سالگرہ کے جشن میں اخبار نویسوں کو کچھ انعام ملا کرتے تھے ۔ اور دہلی کے اخبار والے بھی وہاں جایا کرتے تھے ۔ مجکو بھی اس خیرات کے لیے آمادہ کیا گیا ۔ اور میں وہاں گیا ۔ مگر میرا کوئی اخبار تھا نہ میں شاعر تھا ۔ جسکی بنا پر مجھے کچھ ملتا ۔ شہزادہ میرزا محمد اشرف صاحب بی اے دہلوی کے نام جو وہاں ایک افسر تھے (اب بھی اسی ریاست میں افسر ہیں) شہزادہ میرزا امیر الملک صاحب کا خط لے کر گیا تھا جن کی بدولت ایک وقت شہزادہ صاحب نے اپنا مہمان بنایا مگر دوسرے وقت کہہ دیا کہ سرائے میں جا کر ٹھیریئے ۔ چنانچہ میں نہایت ذلت سے ریاست کی سرائے میں آن پڑا ۔ جہاں اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند دن گزارے ۔ اور سخت تکلیف و رسوائی کے بعد بے مراد گھر کو واپس آیا ۔

ہمراہیوں نے کہا کہ ہم قصیدہ تمہارے نام سے لکھ دیتے ہیں ۔ وہ پیش کرو ۔ یا کسی فرضی اخبار کے ایڈیٹر بن جاؤ ۔ مگر میں نے اسکو قبول نہ کیا ۔ اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے ضمیر پر اس سفر نے کیسی کیسی قیامت ڈھائی اور مجکو یہ سفر کتنا بے غیرتی کا سفر معلوم ہوا ۔

آج خدا کے فضل سے وہ زمانہ ہے کہ مولانا رحیم بخش صاحب مدار المہام بہاولپور اور بعض نامور اراکین ریاست مجکو بہاولپور آنے کی دعوت دیتے ہیں اور مجکو جانے کی فرصت نہیں ملتی ۔ یا وہ وقت تھا کہ میں ایک بھیک مانگنے والے کی حیثیت سے وہاں گیا ۔ اور سرائے میں پڑا رہا تھا ۔ اور اخبار والوں اور شاعروں کے ساتھ چند روپے حاصل کرنے کے لیے میں نے دربدر کے دھکے کھائے تھے ۔ آج وہی شہزادہ میرزا محمد اشرف میرے دوست ہیں اور مجکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنہوں نے ایک وقت سے زیادہ (بوجہ مجبوری ملازمت جسمیں سائلوں کا مہمان کرنا جائز نہ تھا) مجکو اپنے گھر میں

رہنے نہ دیا تھا۔

اس واقعہ میں نصیحت ہے نااہل سائلوں کے واسطے۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا اور اپنی معاش اپنی محنت سے کمانا ہزار عزتوں کی ایک عزت ہے اور دوسرے کا محتاج بننا۔ یا دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانا لاکھ ذلتوں کی ایک ذلت ہے۔

کیسی ہی تنگ دستی اور مفلسی ہو دوسرے کے دروازہ پر سوال نہ کرو اور محنت مزدوری کرکے مفلسی سے لڑو۔ کسی پیشہ اور محنت سے نہ شرماؤ کہ اپنے ذاتی کام میں کچھ بے غیرتی نہیں ہے۔

بزرگوں نے کہا تھا طمع کے تین حرف ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ میں نے اس سفر میں اسکو آزمایا۔ اور طمع کو بالکل خالی پایا یہی وجہ تھی کہ اتنے طولانی سفر سے خالی ہاتھ واپس آیا اور راستہ کے خرچ کے لیئے جو قرض لے کر گیا تھا وہ مدت کے بعد ادا ہوا۔

اگرچہ طمع کے سبب میں بھاولپور نہ گیا تھا۔ کیونکہ طمع اسکو کہتے ہیں کہ انسان کے پاس موجود ہو اور پھر زیادتی کی خواہش کرے میرے پاس اس زمانہ میں کچھ موجود نہ تھا۔ اور میں طمع سے نہیں بلکہ ضرورت سے مجبور ہو کر بھاولپور گیا تھا مگر قدرت نے مجکو سبق دیا کہ کیوں محنت نہ کی اور مفت کی آمد کا خیال کیا۔ اسکی سزا یہ ملی۔

مزدوری کی خوشی

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب میں کتابوں اور دہلی کی عمارات کے نقشوں کی تجارت کرتا تھا۔ اور دہلی دربار (سنہ ۱۹۱۲ء) کے موقع پر میں سیر کا بوجھ سر پر رکھ کر کیمپوں میں فروخت کرتا پھرتا تھا۔ تو ایک خیمہ میں چند امیر مسافروں نے مجھ سے کچھ خریدا۔ اور حسن نظامی کو مجھ سے دریافت کیا۔ جس کا نام اخباروں میں مشہور ہو چکا تھا۔ میں نے ان سے یہ نہ کہا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں۔ اور کہا درگاہ کے فلاں حجرہ میں حسن نظامی رہتا ہے آپ وہاں جائینگے تو ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ دوسرے دن جب وہ لوگ میرے حجرہ میں آئے اور مجکو

وہاں دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ میں ہی حسن نظامی ہوں تو ان کو بہت افسوس ہوا کہ میں اس قدر غریب ومفلس ہوں کہ اتنا بوجھ سر پر رکھ کر کوسوں کی منزل طے کرتا ہوں تو میں نے ان سے کہا کہ یہ بات افسوس کی نہیں ہے بلکہ خوشی کی ہے کہ میں اپنی روزی محنت سے مزدوری سے حاصل کرتا ہوں۔ بھیک نہیں مانگتا۔

اسوقت میرے دل میں ایسی خوشی کی لہریں تھیں جو بھاولپور کے مذکورہ سفر کی ذلت کے مقابلہ میں بادشاہی کی خوشی معلوم ہوتی تھیں۔

پیر بھائیوں کو چاہیئے کہ وہ بھی ہمیشہ اپنی روزی ذاتی محنت سے حاصل کریں۔ اور سوال یا سوال کی قسم کی کسی عادت سے سروکار نہ رکھیں کہ اسمیں روح کا انبساط فنا و مضمحل ہو جاتا ہے۔

سفر بمبئی

۱۹۰۷ء میں بمبئی کا سفر پیش آیا۔ جہاں مسلسل چار مہینہ ٹھیرنا ہوا۔ اسی سفر میں سب سے پہلے غلام نظام قریشی۔ رضا۔ الحق عباسی وغیرہ احمد آبادی احباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اوران کے ہمراہ رات دن کی بے تکلف صحبتوں میں وقت گزرا۔ غلام نظام الدین قریشی پہلے شخص تھے جنہوں نے اس آزادی رندی کے زمانہ میں مجھ سے مرید ہونے کی درخواست کی۔ حالانکہ اس زمانہ میں نہ نماز کی پابندی تھی نہ روزہ کی۔ نہ کچھ اور حالات ایسے تھے جن سے ان کو بیعت کی رغبت ہوتی۔ مگر یہ ایک قلبی مناسبت کا اثر تھا جو ازل سے میرے اور قریشی کے دل میں تھی۔ یہ نوجوان پارٹی بہت آزاد خیالی اور خوش باشی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اور مذہبی امور کا ذکر محض قومی اور سیاسی حیثیت سے انہیں ہوتا تھا جیسا کہ آج کل انگریزی داں جوانوں میں ہوتا ہے مگر خدا کی شان ہے کہ انسب رندان خراباتی کی پارٹی ایک دن میری مرید ہوگئی۔ اور ایسی مرید ہوئی کہ آج میں ان کے خلوص و ربط قلبی پر فخر کرتا ہوں۔

اسی سفر میں دوران میں گجرات وکاٹھیاواڑ کا مفصل چکر لگایا جسکی پوری کیفیت

روزنامچہ ہندوستان میں مذکور ہے ؎

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک سفر بمبئی سے واپس آکر دہلی میں رہنے لگا تھا۔ مضامین نویسی اور تجارت کتب کا مشغلہ جاری تھا۔

اسی زمانہ میں ایک شخص کا خط میرے نام دہلی سے آیا جس میں انھوں نے اپنی پہیلی کے خواب کی تعبیر پوچھی تھی۔ میں نے اس کا جواب دیا۔ کچھ دن کے بعد ایک فیشن ایبل نوجوان صاحبزادے چاندنی چوک میں محمد میرزا صاحب آئینہ فروش کی دکان پر ملے۔ اور معلوم ہوا کہ خط انھوں نے بھیجا تھا۔ اور ان کا نام سید محمد ارتضیٰ ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ عربک اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ان کو اخبارات کا بہت شوق تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اور خادم تخلص تھا۔

اس تعارف کے بعد ایک دن وہ مجھ کو بازار میں پھر ملے۔ میں نے دیکھا کچھ غمگین افسردہ ہیں۔ سبب پوچھا۔ تو معلوم ہوا انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو تسلی دی۔ اور اپنے ہمراہ چونسٹھی قبر کے قیام گاہ پر لے گیا۔ جہاں میں مستقل طور سے رہتا تھا۔ مکان پر آکر میں نے ان سے زندگی کی کامیابی و ناکامی پر بہت سی باتیں کیں۔ اور ایسی ہمدردی کا اظہار کیا کہ وہ خوش ہو کر واپس گئے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ اور مجھ کو ان سے محبتانہ برتاؤ سے ایک طرح کی وابستگی ہو گئی۔ اگر وہ نہ آتے تو میں راہ دیکھتا۔ اور آ جاتے تو خوش ہوتا۔ رفتہ رفتہ تعلقات اتنے بڑھے کہ انھوں نے اسکول کی تعلیم چھوڑ دی۔ اور رسالہ نظام المشائخ جاری کرنے میں میرے شریک ہو گئے۔ حلقہ المشائخ قائم کرنے کا زمانہ تھا۔ اور رسالہ اس کے مقاصد کی اشاعت کے لیے نکالنا تجویز ہوا تھا۔

اہلیہ کے انتقال اور [illegible] کے طوفان کے بعد میں کلکتہ چلا گیا۔ اور سید محمد ارتضیٰ صاحب نے میری عدم موجودگی میں رسالہ کے کام کو سنبھالا۔ واپس آیا تو سید صاحب نے میرے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور واحدی لقب حاصل کیا۔ اس کے بعد سے دنیا نے ان کو محمد الواحدی کے نام سے یاد کرنا شروع کیا۔ اور آج تک وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔

واحدی صاحب

کے ساتھ مسلسل پانچ برس تک یک جائی رہی۔ اور مجھ میں اپنی اتنی محبت ہوگئی جو میری ساری زندگی میں بے مثال مانی جائے گی۔ ایک جگہ رہنا۔ ایک جگہ کھانا۔ ایک ساں پہننا۔ ایک ساتھ بازار میں نکلنا۔ غرض ایک جان دو قالب کی طرح میرا ان کا زمانہ بسر ہوا۔

میں ان کے بغیر ایک ساعت بسر نہ کرسکتا۔ اور وہ مجھ بن ایک لمحہ نہ گزار سکتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جب مجکو سفر مصر و شام و حجاز میں جانا پڑا تو مجھ ہی پر یہ جدائی شاق نہ تھی واحدی صاحب نے بھی یہ ایام ایسی افسردگی میں کاٹے کہ دیکھنے والوں کو ہم دونوں کی محبت پر تعجب ہوتا تھا۔

واحدی صاحب بہت مغلوب الغضب۔ اور بہت ضدی طبیعت کے تھے۔ مجھ میں ان میں باوجود پیری مریدی کے تعلق اور سچی بے انتہا محبت کے ناچاقی بھی ہوتی تھی اور وہ بعض اوقات اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اگر دوسرے کو اس رنجش کا حال معلوم ہوتا تو وہ کبھی یہ نہ مانتا کہ ان دونوں میں پھر بھی میل جول ہوسکے گا۔ مگر دوسرے ہی دن ہم دونوں پھر ویسے ہی ایک ہو جاتے تھے۔ میرے مزاج میں تلون اور عجوبہ پسندی اور ملاقاتوں کا شوق حد سے زیادہ۔ ان کے مزاج میں آدم بیزاری۔ ضد۔ غصہ کی کچھ انتہا نہ تھی۔ مگر پانچ برس تک ان دو متضاد قوتوں نے یکجا مل کر کام کیا۔ اور ایسے ملاپ کی شان سے کیا کہ دوسرے حیران رہ گئے۔

یہی زمانہ میری اور انکی مستقل شہرت اور تجربے حاصل کرنے کا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء بڑے لطف و اتحاد سے گزرے۔ ۱۹۱۱ء میں سفر مصر و شام سے واپس آیا تو پھر واحدی صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔

واحدی صاحب کی نسبت آجکل میری یہ رائے ہے جبکہ وہ نظام المشائخ اور رسالہ خطیب و درویش پریس کے مالک اور ایک شاندار عملہ اور کروفر کے دفتر کے افسر ہیں کہ

اب انہیں پہلے کی نسبت زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ لوگوں سے خندہ پیشانی کیساتھ ملتے ہیں ضد اور غصہ میں نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ اور قوم و ملک کے مسایل کو لیڈروں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اور دماغی قوت اتنی اچھی ہے کہ ہر معاملے کے نیک و بد پر عاقلانہ دوراندیشی کی صحیح رائے دے سکتے ہیں۔ اور میری ان کی خصوصیت پہلی جیسی تمام و کمال نہیں تو تمام دنیا کے لوگوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ تاہم میں ان کو کامیاب نہیں سمجھتا کیونکہ انہوں نے تجارت سیکھ لی ہے۔ میری انشا پردازی کی وراثت حاصل نہیں کی۔ جس کے ارمان کو قبر میں لے کر جاؤں گا۔

میں ان کو محبت کے دوستوں میں سب سے اول سمجھتا ہوں۔ اور ان کے سوا اور کسی پر ناجایز خفا ہونے اور جلانے ستانے اور رنجیدہ کر کے خوش ہونے کی خواہش مجکو نہیں ہوتی۔ نہ ان کے سوا مجھے کوئی اور نظر آتا ہے جو میرے ناز جا و بیجا اٹھا سکے۔

دنیا کو ان کی زندگی ایک تاجر کی سی معلوم ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی وہ حد سے بڑھ کر تاجر ہو گئے ہیں۔ پھر بھی جو شریف پروری اور وضعداری اور سچ بولنے کی عادت ان میں ہے وہ بہت کم تاجروں میں پائی جائے گی وہ بہت زیادہ سچے ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر مجھ سے بہت کم سچ بولتے ہیں۔ اور میں خوش ہوں کہ جھوٹ کی تخصیص بھی انھوں نے میرے واسطے مخصوص کر دی ہے جس میں اور کوئی شریک نہیں ہے۔

۱۹۱۳ء اس سنہ میں میرٹھ سے اخبار توحید کا جاری کرنا اور وہیں جا کر رہنا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ میرٹھ کے مشہور خاندان خان بہادر شیخ الٰہی بخش صاحب اور ان کے بھائی خان بہادر حافظ عبدالکریم صاحب سی آئی ای سے ہندوستان میں اکثر مسلمان واقف ہیں۔ غدر ۵۷ء کے ہولناک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ بڑے بڑے احسان کیے تھے۔ اور جامع مسجد دہلی کے واگذاشت کرانے اور فوجی قبضہ انگریزی سے چھڑا کر مسلمانوں کے حوالہ کرنے میں بڑی جانفشانی اور خرچ برداشت کیا تھا

دہلی میں شہرت ہو کہ جامع مسجد میرٹھ والوں نے چھڑائی اور لاکھوں روپے اس کام میں خرچ کر دیئے مگر اس میں شک نہیں کہ حافظ صاحب اور ان کے خاندان نے مسلمانوں کے ساتھ خفیہ و علانیہ بہت سلوک کیا ہے اور کام انگریزی میں اس خاندان کی عزت امتیاز خاص سے پائی جاتی ہے۔ مرحوم حافظ صاحب مذکور کے حقیقی نواسہ اور موجودہ رئیس خاندان خان بہادر شیخ وحید الدین صاحب کے بھانجہ اور داماد مولوی شیخ احسان الحق صاحب جو ایک ہونہار اور تعلیم یافتہ جوان تھے میرے میرٹھ جانے اور رہنے کے باعث ہوئے۔ اور اخبار توحید انہی کے خرچ سے جاری ہوا۔

شیخ احسان الحق صاحب کئی برس سے ملتے جلتے تھے، اور نظام المشائخ کے خریداروں میں سب سے پہلا نام ان کا تھا۔ وہ عربی کے منشی اور انگریزی کے ایف۔ اے تک تعلیم یافتہ تھے۔ اور مجھ کو انہیں محبت و اخلاص کی سب سے زیادہ نمایاں شان نظر آتی تھی۔

ابتدا سے مجھ کو اس بات کی دھن رہتی تھی کہ میری طرح اور لوگ بھی اردو کی انشاپردازی سیکھیں چنانچہ واحدی صاحب کے علاوہ بہت سے نوجوانوں کو تقریر و تحریر کا شوق دلایا کرتا تھا۔ اور جس شخص میں ذرا سا مادہ انشاپردازی کا دیکھتا تو بہت زیادہ متوجہ ہو کر اسکو مشق کی رغبت دلاتا۔ سیوہارہ ضلع بجنور کے مقبول احمد نظامی فطرتی عسرت کے زمانہ میں برسوں میرے ساتھ رہے۔ یعنی جب میری حالت مفلسی کی تھی تو انہوں نے کئی برس میری خدمت کی۔ اور رات دن میرے ساتھ رہے۔ ان کو بھی لکھنے کی تاکید کرتا تھا۔ انہوں نے ایک حد تک میری تقلید میں لکھنے کی مشق بہم پہونچائی تھی۔ اسی طرح اور چند نوجوان تھے جو آج کل مضامین نویسی میں پورے مشاق ہو گئے ہیں۔

شیخ احسان الحق صاحب کے ساتھ رہنے کو میں نے اس وجہ سے بھی قبول کر لیا کہ مجھکو ایک تعلیم یافتہ جوان میں ادبی قابلیت پیدا کرنے کا شوق تھا۔ اور میں ان میں اسکی بہت صلاحیت پاتا تھا۔

اخبار توحید جس شان سے نکلا۔ اور پانچ مہینے کی زندگی میں جو مقبولیت اس نے حاصل کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہفتہ وار اخبار نکالنے کا میرے واسطے یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے فضل سے میں اس کوشش میں اپنے تمام ہمعصروں سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ بلحاظ اشاعت، زبان، جدت مضامین۔ اور انشاپردازی کے اس کا ثانی ہندوستان میں کوئی اردو اخبار نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ کہو تکبیر والی تقریر چھاپنے کے جرم میں سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ کی گورنمنٹ نے اسکو جبراً بند کرا دیا۔

اخبار توحید کے سلسلہ میں جو مشکلات حکومت کی طرف سے میری ذات کو پیش آئیں اور جو نقصانات شیخ احسان الحق صاحب نے برداشت کئے ان کے اسباب اس قسم کے ہیں جن کا شائع کرنا بعض دلوں کو رنجیدہ کرے گا۔ اس واسطے ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے اس موقع پر محمد انوار صاحب ہاشمی کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اخبار توحید کے منتظم کل اور بھیا احسان کے قوت بازو اور میرے معاون خصوصی تھے۔ اور جنکی قابلانہ محنتوں سے اسوۂ حسنہ وغیرہ کارنامے ظاہر ہوئے اور جو آج تک بھیا احسان کی روح رواں ہیں۔

کہو تکبیر میری ایک تقریر کا عنوان تھا۔ جو کانپور کی مسجد اور وہاں کے مسلمان مقتولوں مجروحوں قیدیوں کی حمایت میں جامع مسجد میرٹھ میں جمعہ کے دن ہوئی تھی، اور جو ہندوستان میں ایک کروڑ سے زیادہ شائع ہوئی کیونکہ ہر صوبہ کے مسلمانوں نے اسکی لاکھوں کاپیاں چھپوا کر دیہات میں تقسیم کرائی تھیں۔ اور اردو کے تمام اخبارات نے اسکو چھاپا تھا۔

ہندوستان میں شاید کوئی مذہبی تقریر اتنی مقبول نہ ہوئی ہوگی۔ اور اس نے یہ اثر پیدا نہ کیا ہوگا جو کہو تکبیر کو خدا نے دیا۔ وہ عربی و ترکی اخبارات میں حواشی و رسوم کے ساتھ شائع ہوئی۔ اور قسطنطنیہ کے ایک دوست نے اس زمانہ میں مجھکو لکھا تھا کہ تمہاری تقریر کہو تکبیر کا ترجمہ پڑھ کر :-

انور پاشا بہت خوش ہوئے اور اسکی تعریف کی

ہندوستان کے ہزاروں آدمیوں نے اسکو حفظ یاد کر لیا تھا۔ اور شاید اب بھی کچھ آدمی ایسے ہوں گے جنکو وہ یاد ہو۔

اس تقریر کی بنا پر بعض علاقوں میں میرا نام کہو تکبیر رکھدیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد جب بانکی پور کے جلسہ میں گیا تو ہزاروں آدمی میرے موٹر کے ساتھ تکبیریں پڑھتے تھے۔ اور کہو تکبیر کہو تکبیر کے نعرے لگاتے تھے۔

سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر جنہوں نے اس تقریر کی ضبطی کا سب سے پہلے حکم دیا تھا اسی تقریر کی بنا پر اپنے ملنے والوں سے جب میرا کچھ ذکر کرتے تو یوں کہتے تھے۔ کہئے آپ کے دوست کہو تکبیر کا کیا حال ہے۔ یعنی حسن نظامی نام نہ لیتے تھے اور کہو تکبیر سے اسکو یاد کرتے تھے۔

اس تقریر کی ضبطی تمام ہندوستان میں ہوئی۔ اور جن جن اخباروں نے اسکو چھاپا تھا عموماً وہ بھی ضبط کر لیے گئے۔ گجرات کا اسلامی اخبار پولیٹیکل بھومیہ محض اسی تقریر کے ترجمہ گجراتی چھاپنے پر حکماً بند کرا دیا گیا۔

حیدر آباد کے سابق وزیر اعظم سر سالار جنگ سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمائش کی کہ کہو تکبیر والی تقریر اپنی زبان سے سنا دیجئے تاکہ میں فخر کروں کہ خود اس کے مصنف سے میں نے اسکو سنا ہے۔

زندگی میں موت

مجکو اپنی زندگی میں دو مرتبہ موت کی خبر سننے کا موقع ملا۔ ایک تو خاندان کے کسی دشمن نے اخبار وکیل امرتسر۔ وطن لاہور۔ پیسہ اخبار لاہور کو لکھدیا تھا۔ جبپر ان اخبارات نے بڑے بڑے نوٹ تعزیت کے لکھے تھے۔ اور میرے احباب میں بڑی تشویش اس سے پیدا ہو گئی تھی۔

اور دوسرا واقعہ میرٹھ میں پیش آیا۔ کہو تکبیر کی تقریر کے زمانہ میں ۲۴ر اگست کو ایک بڑے بلوہ کا اندیشہ میرٹھ میں کیا جاتا تھا۔ اور چونکہ باشندگان شہر میں ہر شخص کو یہ خیال

تھا کہ میں ۲۴ راگست کو میرٹھ میں فساد کراؤں گا اور حکام بھی اس شہرت سے انتظامات میں مصروف تھے اسلیئے ۲۴ راگست کے دن جبکہ شہر میں فوجیں اور توپ خانے گشت کر رہے تھے کسی شریر نے دہلی میں مشہور کر دیا کہ میرٹھ میں بلوہ ہو گیا اور حسن نظامی اسمیں مارا گیا۔

سب سے پہلے یہ خبر صدر بازار دہلی سے کسی شخص نے دفتر اخبار کا مریڈ کو رات کے وقت بذریعہ ٹیلیفون دی۔ مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی اسوقت تراویح پڑھنے مسجد میں گئے ہوئے تھے۔ ان کو یہ خبر مسجد میں پہنچائی گئی۔ اور طرفۃ العین میں ہزاروں مسلمان جمع ہو گئے۔ اور اس خبر پر رائے زنی ہونے لگی۔ بعض جوشیلے لوگ انتقام کی صلاح دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اسی وقت دہلی میں ہنگامہ کر دینا چاہیئے۔ مگر مسٹر محمد علی شوکت علی نے احتیاط و صبر سے کام لیا۔ اور واحدی صاحب سے دریافت کیا گیا۔ ان کو کچھ خبر نہ تھی۔ تاہم انہوں نے کہا میں ابھی میرٹھ جا کر اس قصہ کی تحقیقات کرتا ہوں۔

یہ بڑے امتحان کا وقت تھا۔ ہر شخص کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ خطرہ میں پڑے اور میرٹھ جائے۔ واحدی صاحب کے رشتہ داران کو روکتے تھے کہ تم آدھی رات کو وہاں نہ جاؤ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تم اپنے آپ کو کیوں بلا میں پھنساتے ہو۔ مگر واحدی صاحب کی محبت مرتے دم تک مجکو یاد رہے گی کہ انہوں نے کسی مشورہ کی پروا نہ کی۔ اور بارہ بجے کی ریل میں سوار ہو کر دو بجے میرٹھ پہنچے۔ اور سحری کے وقت مجکو میرٹھ میں جا کر جگا یا وہ مجکو لالٹین سے جھک جھک کر دیکھتے تھے کہ میں وہی حسن نظامی ہوں جو ان کے ساتھ ۵ برس تک رہا۔ یا کوئی دوسرا آدمی ہے اور ان کی آنکھیں غلطی کر رہی ہیں۔ میں حیران تھا کہ وہ اپنی متانت و سنجیدگی کے خلاف یہ کس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں۔

کیونکہ مجکو اصل واقعہ کی کچھ خبر نہ تھی۔ آخر قصہ معلوم ہوا تو کچھ دیر بہت لطف رہا اور صبح کی گاڑی میں واحدی صاحب دہلی واپس گئے تا کہ دہلی والوں کو مطمئن کریں۔

انھوں نے دہلی آ کر عام اعلان کر دیا۔ اشتہار بھی تقسیم کیے اور زبانی بھی کہا کہ فساد میرٹھ

اور قتل حسن نظامی کی خبر غلط ہے۔ تب بھی ہزاروں آدمیوں کو یقین نہ آیا۔ اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ بابو ضرور ہوا ہے کسی مصلحت سے اسکو چھپایا جاتا ہے۔

گھر میں ماتم کی صف

واحدی صاحب کو شہر کے ہجوم اور ہل چل میں اتنی فرصت نہ ملی کہ میرے گھر میں خیریت کی خبر بھیجتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری لڑکی حور بانو کو میرے مارے جانے کی خبر پہونچی۔ اور اس بے ماں کی بچی نے رونا شروع کیا۔ خاندان کے دشمنوں کو بھی اس لڑکی سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اور ہندو مسلمان عورت مرد سب جمع ہوکر ماتم و افسوس کرنے لگے۔ آدھی رات تک ساروزے افطار۔ سرے سے کسی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ آخر حور بانو کے خالو پیرزادہ سید محمد صادق صاحب چند قرابت داروں کے ساتھ اسی رات والی ریل میں میرٹھ آئے اور دو بجے پھر مجھکو جگایا گیا۔ اس دفعہ میں خود ان کے ہمراہ دہلی آگیا اور کھلی بگھی میں سوار ہوکر سارے شہر میں پھرا تاکہ سب لوگ دیکھ لیں اور مطمئن ہو جائیں۔ مجھے ہنسی آتی تھی جب خلقت قریب آ آکر مجھکو دیکھتی تھی۔ شاید اسکو شبہ ہوگا کہ حسن نظامی کا بناوٹی پتلا گاڑی میں بٹھا دیا گیا ہے۔

جس وقت میں اپنے گھر میں آیا ایسا جوش خوشی کا میں نے لوگوں میں دیکھا جس میں دوست دشمن سب شریک تھے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہوسکتا۔ صدقے دیئے گئے نیازیں دلوائی گئیں اور حور بانو مجھ سے لپٹ کر خوشی کا رونا روئیں۔

میرٹھ کے قیام کی مختصر زندگی میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ اور احباب کا خیال ہو کہ تحریر کا جو زور اور اثر میرٹھ کے قیام میں پایا گیا وہ نہ پہلے تھا نہ بعد میں باقی رہا۔

اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، مگر میرا خیال یہ ہے کہ میرٹھ کی آب و ہوا مجھکو بہت موافق تھی۔ اور میں نے جو کام وہاں کیا پوری تندرستی کی حالت میں کیا۔

شیخ احسان الحق صاحب

سے جدا ہوکر دہلی آیا تو پھر واحدی صاحب کے پاس نہ ٹھہرا بلکہ اپنے قدیمی گھر یعنی درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں

آکر رہنے لگا۔ شیخ صاحب جنکو لوگ بھیا کہتے ہیں۔ اور میں بھی بھیا احسان کے نام سے انکو پکارتا ہوں توقع سے زیادہ ذہین ثابت ہوئے۔ توحید اخبار کے زمانہ میں وہ لکھنے کا کچھ کام نہ کرتے تھے۔ نہ ان کو مضمون لکھنے کی عادت تھی تاہم ذہنی اور دماغی قابلیت اتنی تھی کہ وہ مجھکو لکھنے میں مشورے دیتے تھے اور بعض خاص موضوع مضامین کے تجویز کرکے مجھ سے ان پر لکھواتے تھے۔ چنانچہ نعت کے مؤثر مضامین۔ موت کے مضامین۔ بزرگوں کی قبور کی لوحیں انہی کے کہنے سے میں نے لکھیں اور کامیاب ہوا۔ اس اعتبار سے وہ میرے معنوی استاد ہیں۔ اور میں نے انکو لکھنے کا طریقہ بتایا اور زور دے کر لکھوانا شروع کیا۔ اس لحاظ سے میں ان کا استاد ہوں۔ اب وہ مذہبی۔ اصلاحی۔ اور تنقیدی رنگ کے بہت اچھے اور زوردار مضامین لکھ سکتے ہیں۔ ان کی تحریر میں فلسفیانہ جدت اور بے مروتی و بے رعایتی ہوتی ہے۔ بے مروتی و بے رعایتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ رائے زنی کرنے میں کسی بزرگ یا دوست یا تعلق والے کی پاسداری نہیں کرتے اور بے لاگ لکھتے ہیں۔ ان کی نظر کتاب یا زیر بحث چیز کے حسن و قبح پر بہت گہری جاتی ہے۔ اور کبھی ان کو کھوٹے کھرے کے پرکھنے میں ناکامی نہیں ہوتی۔ وہ اردو زبان میں سب سے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے تحریروں کے عیب و ہنر کو اصلیت کی شان سے دکھانا شروع کیا۔ ورنہ پہلے صرف تعریف کرنے کا نام ریویو و تنقید تھا۔

میرے آنے کے بعد انہوں نے میرٹھ سے ماہوار رسالہ اسوۂ حسنہ جاری کیا۔ اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم پر زور دیکر عصر جدید میں بھی جان ڈالی۔

اسوۂ حسنہ مذہبی اصلاحی رسالہ تھا۔ اور عصر جدید تمدنی اصلاح کا آرگن۔ اسوۂ حسنہ کو ان کو بہت کامیابی ہوئی اور تھوڑے عرصہ میں اسکی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ مگر عصر جدید کی اشاعت زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اور خواجہ غلام الثقلین کی ناگہانی وفات کے سبب اسکو بند کرنا پڑا۔

بھیا احسان میرے مرید نہیں ہیں۔ مگر مریدوں سے بڑھ کر ادب و محبت پیش آتے ہیں

ادب واخلاق کی ایک منکسرانہ شان جو ان کے خاندان کی مخصوص صفت ہے اول دن سے آج تک ان میں موجود ہے۔

ان کے خاندان کا ایک خاص لباس اور عاجزانہ وضع اور باوضع ملنا جلنا۔ بزرگوں کا رکھ رکھاؤ ایسی چیزیں تھیں جنکو اس خاندان کا ٹریڈ مارک کہنا چاہیئے مگر افسوس ہے کہ اب لباس کی خصوصیت نوجوان پارٹی سے رخصت ہوتی جاتی ہے۔ البتہ حسن ادب اور شائستہ وملنسار طرز ملاقات ابھی تک ہر ممبر خاندان میں موجود ہے۔

ایک ایسا جگر رکھنے اور بے تکلفانہ زندگی بسر کرنے سے رشتہ ادب کا محفوظ رہنا ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ اور میں نے اپنے پڑھنے لکھنے یا ادب میں مرید رنگو دیکھا کہ جب میں ان کے ساتھ بے تکلفانہ برتاؤ کیا تاکہ خودی بزرگی کی مہر ہٹ دور ہو جائے تو وہ عموماً حد احترام سے متزلزل ہو گئے۔ مگر بھیا احسان کا یہ کمال ظاہر کرنے کے قابل ہے کہ وہ سالہا سال کی بے تکلفانہ نشست وبرخاست میل جول۔ بات چیت کے باوجود ایک لمحہ کو بھی حد ادب سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ اور لطف یہ ہے کہ میری بے تکلفی و یکدلی کا جواب بے تکلفی و یک دلی سے دیتے رہے اور ملت کو غیر شگفتہ نہ ہونے دیا۔

میرا خیال ہے یہ ان کی ذاتی خوبی نہیں ہے بلکہ خاندانی سوسائٹی کی تربیت کا وصف ہے جس سے طفلی میں ان کا کیرکٹر بن گیا تھا۔

اب بھیا احسان دہلی میں آ گئے ہیں۔ اور ان کا جسم بھی دل کے ساتھ ہی میرے قریب رہتا ہے۔

واحدی صاحب اور بھیا احسان کے فرق تعلق کو بیان کرنا آسان نہیں ہے میں نہیں چاہتا کہ آئندہ نسلوں کو ان دونوں کی دوستیاں دو رقیبوں کی شکل میں دکھاؤں جیسا کہ بعض اوقات آج کل لوگ قیاس دوڑایا کرتے ہیں۔ مجھکو جو تعلق واحدی صاحب سے ہے وہ بھیا احسان سے قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اور بھیا احسان کو جیسا مجکو سمجھنا اور برتنا اور دل لگانا

اور دل دینا آتا ہے اس سے واحدی صاحب حشر تک آگاہ نہیں ہو سکتے۔

میں ان دونوں کو اپنا سمجھتا ہوں اور یہ دونوں میرے سوا بہت کم لوگوں کو اپنا سمجھتے ہیں۔ بھیا احسان اور واحدی صاحب کی ذلیت میں بیشک فرق ہو۔ مگر قابلیت اور روحانی جوہر دونوں کے مجھ سے زیادہ ہیں۔ بعض باتوں میں واحدی صاحب زیادہ ہیں۔ بعض میں بھیا احسان بڑھ کر ہیں مگر میری محبت کے نکتہ پر دونوں کا اتحاد ہے اور دونوں میری ادبی اور خیالی و عملی زندگی کو فروغ دینا اور زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اختلاج کا مرض دونوں کو ہے۔ دلیری اور بے خوفی ایک میں بھی نہیں ہے۔ میں اپنے جبلی ولولہ سے بے خوف و نڈر ہو کر بے سوچے سمجھے جو کام کر جاتا ہوں وہ ان کو پہلے سے معلوم ہو جائے تو یہ کبھی مجھکو اسکی طرف بڑھنے کی اجازت نہ دیں۔ انکی احتیاطوں نے مجھکو آدھا کر دیا ہے۔ لیکن مجھے اقرار کرنا چاہیئے کہ اگر ان دونوں کی احتیاطیں اور خاکسار صاحب کی سرپرستی مجکو مقید نہ رکھتی تو میں یا تو پھانسی پا چکا ہوتا اور یا نظر بندان ہند کے ساتھ کسی جگہ قید ہوتا۔

مجھے امید ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے کاموں، میری تحریروں اور میری خصوصیات کی فراہمی اور ترتیب بھیا احسان کے ہاتھ سے ہو گی۔ اور اسکو عام اشاعت دینے اور رنگ برنگ طریقوں سے پھیلانے اور پائدار و موثر کرنے کا فرض واحدی صاحب کے ہاتھوں سے ادا ہو گا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک

میرٹھ سے واپس آکر درگاہ میں قیام کیا گیا۔ اور اسی قیام نے آٹھ برس ختم کر دیئے۔

آٹھ سال۔ اللہ اکبر زندگی کا ایک بڑا حصہ ہیں خبر نہیں کہاں۔ اور کیونکر چلے گئے اس زمانہ کا خلاصہ حال یہ ہو کہ کتابیں لکھیں۔ شادی کی بچے ہوئے۔ ہندوستان بھر کے چکر لگائے۔ جنگ یورپ کی بہار دیکھی خفیہ پولس کے ہاتھوں ۱۹۱۷ء کے ستمبر تک طرح طرح کے

چھیڑ چھاڑ بہ برداشت کی۔ خطوط پر سنسر (محتسب) مقرر ہوا۔ اور ستمبر ۱۹۱۷ء سے نگرانی پولس کی دور ہوئی۔ رسالہ مرشد جاری کیا۔ وغیرہ یہ تو مجمل خلاصہ تھا۔ اب تفصیلوار بعض حصوں کی تشریح سنیئے

سب سے پہلی تصنیف

غالباً سنہ ۱۹۰۱ء کے شروع یا اس کے کچھ بعد مفلسی کے مجرب علاج کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اسکا ٹھیک زمانہ یاد نہیں ہے اگر تحقیق ہوسکا اور اس رسالہ کی پہلی اشاعت کا کوئی نمبر مل گیا تو لکھدیا جائے گا۔

یہ رسالہ حضرت مولانا جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ تھا جس میں مفلسی دور کرنے اور تونگری حاصل ہونے کی دعائیں اور اعمال درج تھے۔

اس کا دیباچہ میرے نام سے حکیم عبدالستار صاحب لطفی دہلوی نے لکھا تھا۔ جو خاکسار صاحب کے دوست تھے۔

مجھے تجربہ نہ ہونے کے سبب یہ امید نہ تھی کہ یہ رسالہ فروخت ہوسکیگا۔ مگر خاکسار صاحب کے کہنے سے چھپوالیا تھا۔ جس وقت چھپ کر آیا۔ دو سو کاپیاں خیر مجسم حاجی محمد اسحٰق صاحب سوداگر چمڑہ بازار دہلی نے خریدلیں۔ اور اسی طرح دیگر حضرات کی کمیشنک خریداری سے ایک ہفتہ کے اندر اسکی پہلی اشاعت ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے اس کا حق تصنیف خاکسار صاحب کو دیدیا۔ اور اب وہی اسکو چھاپتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کتنی مرتبہ چھپ چکا ہوگا۔ تاہم خیال ہوتا ہے کہ زیادہ ایڈیشن نکلے ہوں گے کیونکہ اعمال کے شوقین لوگ اسکو بہت پسند کرتے ہیں۔ (یہ رسالہ ایک جزو یعنی سولہ صفحہ کا ہے) قیمت ۱؍

دوسری تصنیف

سنہ ۱۹۱۱ء میں سفر مصر و شام سے واپس آکر ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی حصہ اول کے نام سے دو جزو (۳۲ صفحہ) کا ایک رسالہ لکھا جس میں آئندہ زمانہ کے انقلابات اور پیشین گوئیاں امام مہدی کے ظہور کی متعلق تھیں، یہ رسالہ ایسا مقبول ہوا کہ پچاس ہزار کے قریب چھپ چکا۔ چھ دفعہ تو میں نے چھپوایا اور بمبئی وغیرہ چند مقامات میں سارق تاجران کتب نے علیحدہ کئی مرتبہ چھاپ چھاپ کر فروخت کیا۔

اس کے گجراتی مرہٹی ترجمے بھی کئی بار چھپ کر فروخت ہوئے۔

یہی رسالہ تھا جس کی ہر دلعزیزی اور فوری فروخت سے میری مالی حالت درست ہوئی اور دوسری کتابیں لکھنے کی طرف راغب ہوا۔

تیسری تصنیف اس رسالہ کا دوسرا حصہ کتاب الامر عرف امام مہدی کے انصار کے نام سے شائع ہوا۔ یہ چار جزو یعنی ۶۴ صفحہ کا تھا۔ اور اسمیں بھی پہلے حصہ کی طرح پیشین گوئیاں تھیں۔ اور پہلے حصہ میں شہنشاہ انگلستان کے مسلمان ہوجانے کی جو پیشین گوئی تھی اس دوسرے حصہ میں اسپر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اور توریت۔ انجیل و قصیدہ شاہ نعمت اللہ ولی کے اقتباسات دیئے گئے تھے۔

یہ کتاب بھی کئی بار چھپی (غالباً ۸ دفعہ) اور ہاتھوں ہاتھ بکی۔ اور اس کے بھی متعدد ترجمے گجراتی وغیرہ شائع ہوئے۔

یقین کی قوت ان رسالوں کے شائع کرنے کے وقت مجکو شہنشاہ انگلستان کے مسلمان ہونے کا اتنا یقین تھا کہ عین دربار دہلی ۱۹۱۱ء کے وقت خوب جلی قلم اشتہارات (شہنشاہ انگلستان کا مسلمان ہوجانا) کے عنوان سے شاہی کیمپ میں تقسیم کرائے۔ اور خود کنگ جارج کو ایک کتاب بھیجی اور لکھدیا کہ اسمیں آپکے مسلمان ہونے کی پیشین گوئی ہے۔

جس وقت میں یہ کام کر رہا تھا واحدی صاحب مجکو روکتے تھے۔ ڈرتے تھے اور ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے شائع کنندہ کی حیثیت میں اپنا نام لکھنے سے انکار کر دیا تھا مگر میں بالکل بے خوف تھا۔ یا تو یقین کی قوت تھی اور یا دوسروں سے زیادہ میرا دل مضبوط تھا۔ اور کسی مواخذہ سے ڈرتا نہ تھا۔ کنگ جارج نے کتاب کا شکریہ بھجوایا تو یہ ڈرنے والے احباب حیران رہ گئے۔

چوتھی تصنیف سفر بمبئی کا روزنامچہ تھا۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہو یہ بھی ۱۹۱۲ء کے

شروع میں شائع ہوا تھا۔ ضخامت ایک سو دو صفحے اسمیں بمبئی گجرات کاٹھیاواڑ کے حالات ہیں اور اب تک صرف دو مرتبہ چھپا ہے۔ یعنی کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

اسلام کا انجام کے نام سے شیخ توفیق بکری شیخ المشائخ مصر کی کتاب مستقبل الاسلام کا ترجمہ تھا۔ اسمیں مسلمانوں کی تعداد اور اسلام کے انجام کی فلسفیانہ بحث ہے۔ یہ ترجمہ ابتک ۴ مرتبہ چھپ چکا ہے۔ اور پہلا ایڈیشن ۱۹۱۲ء میں چھپا تھا ضخامت ۴۸ صفحہ۔

اسرار کے نام سے حضرت بہاؤ اللہ آفندی بانی فرقہ بابیہ کی کتاب کا اردو ترجمہ تھا۔ اصل کتاب مصر میں حضرت عبد البہا عباس آفندی خلف حضرت بہاؤ اللہ نے مجکو دی تھی۔ اس کتاب میں تصوف کا نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں بیان ہے یہ کتاب بھی چار مرتبہ چھپی ہے اور پہلا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا ۲۰ صفحہ ضخامت۔

مجموعۂ مضامین حسن نظامی ۱۹۱۲ء میں یہ مجموعہ پہلی بار چھپا اسمیں اسوقت تک کے اخباروں اور رسالوں سے میرے لکھے ہوئے مضامین جمع کئے گئے تھے۔ اور مسٹر نیرنگ صاحب بی۔ اے وکیل انبالہ نے اسپر دیباچہ لکھا تھا۔ ایکسو باون صفحہ کی ضخامت تھی یہ مجموعہ دوبارہ نہ چھپا اور بھیا احسان نے ۱۹۱۳ء کے آخر میں سی پارۂ دل کے نام سے ایک بڑا مجموعہ اس کے عوض مرتب کیا۔

سفرنامہ مصر و شام و حجاز دو سو بارہ صفحہ کی ضخامت تھی۔ باتصویر و بے تصویر چھپا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں دفتر اخبار توحید نے شائع کیا تھا۔ اور اب ۱۹۱۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔

اعمال حزب البحر یہ بھی ۱۹۱۳ء کے آخر میں دفتر توحید سے چھاپی تھی۔ ایکسو صفحہ کی ضخامت کی کتاب ہے۔ اور آج تک چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بہت مقبول چیز ہے مشائخ نے اسکو بہت پسند کیا۔

سی پارۂ دل۔ بھیا احسان کی عجیب ترتیب ابواب کے ساتھ میرے تمام مضامین کا

مجموعہ ہے۔ بڑے سائز کے باریک قلم دو سو تین صفحہ ہیں۔ واحدی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اردو نے دیباچے لکھے ہیں (اب یہ تیسری بار چھپا ہے)

غدر دہلی کے افسانے۔ جیسا احسان کی اعتیاد دانی سابقہ مجموعہ مضامین کے بہت سے مضامین سی پارۂ دل میں درج نہ کئے گئے تھے۔ انہی میں غدر دہلی کے قصے بھی نکال دیئے گئے تھے۔ جنکو میں نے ایک رسالہ میں علیحدہ چھاپ دیا۔ چھوٹا سائز اور ایک سو اٹھائیس صفحہ کی ضخامت تھی۔ کئی بار چھپی۔ پہلا ایڈیشن شاید ۱۹۱۴ء کے شروع میں چھپا تھا۔ جنگ یورپ کے شروع ہونے کے بعد اندیشہ ہوا تھا کہ ضبط ہو جائے گی۔ مگر مسٹر ہیلی چیف کمشنر دہلی نے تحریری اجازت اس کے چھاپنے کی دی۔ اور اضافہ مزید کے بعد بڑے سائز پر اسکو چھاپا گیا۔ اور اب چوتھا ایڈیشن اسکا چھپ رہا ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحہ کی ضخامت ہے۔

غدر دہلی کے افسانے حصہ دوم۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی بار اور ۱۹۱۹ء میں دوبارہ چھپا اسمیں انگریزوں کے حالات ہیں۔ ضخامت ۴۸ صفحے۔

فیضان سنوسی۔ یہ شیخ سنوسی کا تیسرا حصہ ہے اسمیں بھی پیشین گوئیاں ہیں ۹۶ صفحہ ضخامت ہے چار دفعہ چھپا اور اب چھاپنے کی ممانعت ہے۔

تین پر ایک۔ یہ چوتھا حصہ شیخ سنوسی کا ہے اسمیں بھی پیشین گوئیاں ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا۔ پھر دوسرا شائع ہوا اس کے بعد ممانعت ہو گئی۔ اور اب فیضان سنوسی و کتاب الامر کی طرح نایاب ہے ۴۰ صفحہ کا تھا۔

ناگفتہ بہ۔ یہ پانچواں حصہ شیخ سنوسی کا تھا اور پیشین گوئیاں ہیں۔ اس کے چھاپنے کی بھی ممانعت ہے۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ ۴۰ صفحہ کا تھا۔

جرمنی خلافت۔ چھٹا حصہ شیخ سنوسی کا تھا۔ پیشن گوئی کے مضمون پر چھپ کر آیا اور ۴۸ صفحہ ضخامت تھی۔ جو فوراً ہی پولیس ضبط کر کے لے گئی۔ ایک نسخہ اب بھی بچنے نہ پایا۔ اب اشاعت کی اجازت مل گئی ہے۔

(۱۶) **اردو دعائیں**۔ ستر صفحہ کی کتاب ہے اور اسمیں ہر قسم کی موثر اردو دعائیں ہیں۔ ۳ بار چھپ چکی ہے۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۳۳۲ ہجری میں چھپا تھا۔

(۱۷) **گور موت**۔ ایک سو ساٹھ صفحہ کی کتاب ہے اور موت یاد دلانے کے مضامین ہیں سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپی تھی۔

(۱۸) **قبروں کے غیبی نوشتے**۔ اسمیں الواح قبور ہیں اور بہت دلچسپ و عجب طرز کی کتاب ہے۔ خیالی و اصلاحی لوحیں نامور لوگوں کی لکھی گئی ہیں سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپی ہے ضخامت ۸۵ صفحہ

(۱۹) **محرم نامہ**۔ واقعات کربلا اور اسلام کے دور اول کی تاریخ ہے بہت ہی مقبول کتاب ہے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۲ء میں چھپا تھا تین بار چھپ چکا ہے ۱۹۶ صفحہ کی کتاب ہے۔

(۲۰) **میلاد نامہ**۔ میلاد شریف اور اسلام کی تاریخی کتاب ہے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ چار بار چھپ چکا ہے ۱۶۲ صفحہ کی ضخامت۔

(۲۱) **بیوی کی تعلیم** سنہ ۱۹۱۶ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا زنانہ تعلیم کے لئے بہت پسند کی گئی۔ چار بار چھپ چکی ہے۔ ۱۴۴ صفحہ ضخامت ہے۔

(۲۲) **یزید نامہ**۔ محرم نامہ کا دوسرا حصہ۔ کربلا کے بعد کی تاریخ ہے۔ بنی امیہ کے خاتمہ تک پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا۔ اور دوسرا اب چھپا ہے ۱۵۵ صفحہ کی ضخامت ہے۔

(۲۳) **اتالیق خطوط نویسی**۔ دو حصوں میں پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۲ء میں چھپا تھا سنہ ۱۹۱۶ء میں دوبارہ چھپی۔ اسمیں میرے خطوط اور نامور مسلمانوں کے خطوط ہیں ۱۲۰ صفحہ کی ضخامت۔

(۲۴) **مجموعہ خطوط حسن نظامی**۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ ایکسو بیس صفحہ کی ضخامت ہے۔

(۲۵) **محفل نامہ گیارہویں شریف**۔ حضرت غوث پاک رضی کے حالات میں ہے۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔ ۸۰ صفحہ کی کتاب۔

(۲۶) **کرشن بیتی**۔ سری کرشن کے حالات میں بہت مقبول و نامور تصنیف ہے ۱۴۴ صفحہ کی ضخامت ہے۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ اب دوسرا چھپا ہے۔ بالضرور پڑھئے۔

سیر دہلی۔ دہلی کی گائڈ اردو زبان میں ہے۔ ۸۰ صفحہ کی کتاب اور باتصویر ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔

[29] انتخاب توحید۔ اخبار توحید کے مضامین کا مجموعہ ہے جو بھیا احسان نے سنہ ۱۹۱۳ء میں چھاپا تھا۔ ختم ہو گیا۔ ۲۰۷ صفحہ کی ضخامت تھی اس میں زیادہ تر میرے مضامین تھے۔

چٹکیاں اور گدگدیاں۔ اس میں میرے ظرافت کے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۹ء میں چھپا...... ضخامت صفحہ ۱۱۵۔

[31] جگ بیتی۔ اس میں میری لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ۸۰ صفحہ کی ضخامت ہے پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔

[32] رسولؐ کی عیدی۔ بچوں کے لیے مفید و دلچسپ مضامین ہیں پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔ پانچ بار چھپ چکی ہے۔ چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحے ہیں۔

[33] فلسفۂ شہادت۔ شہادت کربلا کا فلسفیانہ ٹریکٹ ہے ۲ بار چھپا ہے چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحہ کی ضخامت ہے۔

[34] توپ خانہ۔ جنگ یورپ شروع ہونے کے وقت چھوٹا سا ٹریکٹ لکھا گیا تھا۔ کئی بار چھپا صفحہ ۳۲۔

[35] بندوق۔ ۱۶ صفحہ۔ بم ۱۶ صفحہ۔ چھری کا اعلان جنگ ۳۲ صفحہ۔ مکھی کا میدان جنگ ۳۲ صفحہ ہوائی جہاز۔ جرمنی شہزادہ کی لاش ۱۶ صفحہ یہ سب چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ ہیں اور کئی بار چھپے ہیں اور ان میں تصوفانہ طریقہ سے بحث کی گئی ہے۔

فرائض قبلہ کو شملہ۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک خط لارڈ ہارڈنگ کو لکھا گیا تھا ۱۸ صفحہ کی ضخامت ہے دو بار چھپا ہے۔

خدائی انکم ٹیکس۔ زکوٰۃ کا ٹریکٹ۔ ۴ صفحہ ضخامت سنہ ۱۹۱۷ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ ختم ہو گیا اب مزید اضافہ کے بعد چھپا ہے۔

مرشد۔ ۴۰ صفحہ۔ دینی یادداشت۔ ہمارے رسول کی عادتیں۔ آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن غرض اسطرح متعدد چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ بار بار چھپکر شائع ہو چکے ہیں۔

ان کتابوں پر رائے

چھوٹی بڑی چھیالیس کتابیں ہیں۔ جو چھپ کر شائع ہوئیں۔ انمیں سے بعض بہت مختصر ہیں اور بعض ضخیم۔

نمبر ۴۰ کے سمت میں مرشد جس کتاب کا نام لکھا گیا وہ ماہوار رسالہ مرشد سے علیحدہ چیز ہے۔ اسمیں علمی مضمون ہے اور اب اسکا پہلا ایڈیشن باقی نہیں رہا۔ اور دوسرا چھاپنے کا موقع نہیں ہوا۔ دینی یادداشت میں بچوں کی دینی معلومات کا بہت اچھا ذخیرہ تھا ہزاروں کی تعداد میں کئی بار چھپا اب موجود نہیں ہے۔ ہمارے رسول کی عادتیں بھی بہت مفید ٹریکٹ تھا کئی بار چھپا۔ اب کم فرصتی کے سبب نہیں چھپتا۔ آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن ایک دلچسپ خط ہے جو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کو بھیجا گیا تھا جبکہ وہ اصلاحات کی تحقیق کے لیے ہندوستان آئے تھے۔ اور طرح طرح کے اصلی و فرضی ڈیپوٹیشن انکی خدمت میں پیش ہو رہے تھے۔ تو میں نے آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن کے نام سے ان کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ نام سے ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا رسائل و کتب میں پبلک کو جو کتابیں سب سے زیادہ پسند ہیں اسکا اندازہ بکری سے کرنا چاہیے۔ میں ناظم صاحب حلقۃ المشائخ سے جو میری کتابوں کے ناشر و پبلشر ہیں ہر مہینہ کے خاتمہ پر ایک نقشہ منگا کر دیکھتا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ بکری میں کونسی کتاب سب سے زیادہ ہے تو پانچ کتابیں سب سے بڑھی چڑھی رہتی ہیں ایک میلاد نامہ دوسرے بیوی کی تعلیم۔ تیسرے غدر دہلی کے افسانے۔ چوتھے محرم نامہ پانچویں حزب البحر۔ ان پانچوں میں بھی تین کتابوں کا مقابلہ رہتا ہے کسی مہینہ میں میلاد نامہ بڑھ جاتا ہے اور کسی میں بیوی کی تعلیم اور کسی میں غدر دہلی کے افسانے (حصہ دوم اسکا کم بکتا ہے) بعض متبرک مہینوں میں حزب البحر کی بکری سب سے بڑھ کر ہوتی ہے کیونکہ ان ایام میں اسکی زکوٰۃ دیتے

والے زیادہ خریدتے ہیں۔ ایام محرم قریب ہوتے ہیں تو محرم نامہ اور یزید نامہ کی فروخت سب کتابوں پر فائق ہوتی ہے۔

پبلک میں صاحب رائے جماعت میری کل تصنیفات میں غدر دہلی کے افسانوں کو سب سے زیادہ کامیاب تصور کرتی ہے۔ اور اسکی ماسٹر پیس (چوٹی کی چیز) کا خطاب دیا جاتا ہے۔ فلسفی اور بہت اعلیٰ طبقہ والے کم پڑھے لکھوں کو پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ کا یہی خیال ہے۔

لیکن میں خود میلاد نامہ۔ محرم نامہ۔ یزید نامہ اور بیوی کی تعلیم کو اپنی کامیاب تصانیف خیال کرتا ہوں۔

میں نے کسی کتاب میں اتنی محنت نہیں کی جتنی تلاش و عرق ریزی کرشن بیتی لکھنے میں ہوئی۔ مگر وہ مذکورہ پانچ کتابوں کی طرح کچھ زیادہ فروخت نہیں ہوتی۔ البتہ تعریف ہندو مسلمان دونوں کرتے ہیں۔ اور بعض قومی و ملکی خیال کے لوگ اسی کو سب سے بڑھکر درجہ میری تصنیفات میں دیتے ہیں (آج کل بھوپال ریاست نے کورس میں شامل کیا ہے)۔

سی پارہ دل اور چٹکیاں گدگدیاں بھی پسند کی جاتی ہیں۔ اور بہت بکتی ہیں مگر ان کی قبولیت محض انشا پرداز یا ادب پسند طبقہ میں زیادہ ہے۔

رہنما میرٹھ کی ایسی کتاب ہے جسمیں سب کتابوں سے زیادہ لاگت لگائی گئی اور بہت ہی اعلیٰ اہتمام سے اسکو چھپوایا۔ مگر سب کتابوں سے زیادہ ناکام ہوئی۔ بہت ہی کم بکتی ہے۔ اسکی وجہ بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسمیں سلطنت کے افسروں کی تعریف ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ وجہ اسکی ناکامی کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب ایک محدود شہر کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی کتاب کی بدولت گورنمنٹ نے میری نگرانی دور کی۔ اور میری شدید مشکلات کا خاتمہ ہوا جو تقریباً دس سال سے جاری تھیں۔

بھیا احسان اور واحدی صاحب کہتے ہیں کہ اب میری تحریروں میں دو خصوصی جدت

اور وہ نہیں پایا جاتا جو سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک تھا۔ میں نہیں جانتا یہ کہنا درست ہے یا نہیں۔ البتہ یہ خیال مجھکو بھی ہوتا ہے کہ کم فرصتی اور زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تحریر میں وہ خوبی پیدا نہیں کرسکتا جو فرصت کے زمانہ میں ہو جاتی تھی۔ اور کچھ یہ بھی ہو کہ وہ وقت جوش اور نمو کا تھا۔ تندرستی اچھی تھی۔ اب زوال اور کمزوری کا زمانہ ہے۔

الفاظ کی تکرار

واحدی صاحب کو اسکی چڑ ہے کہ عبارت میں ایک وضع کے الفاظ بار بار آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپکی تحریر میں تکرار الفاظ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ان کا یہ کہنا غلط نہیں ہے۔ لیکن۔ مگر۔ اور۔ وغیرہ الفاظ ناوانستہ بار بار میری قلم سے نکلتے ہیں۔ جن کا روکنا میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ اگر میں ان کا خیال رکھوں تو آدھا کام بھی نہ کرسکوں۔ میرا خیال ہے کہ شروع زمانہ میں صاف دلچسپ عبارتیں بہت سی لکھدیں۔ اب زمانہ عبارت آرائی کا نہیں ہے بلکہ مفید اور ضروری مضامین اردو زبان میں جمع کرنے کا وقت ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ میں قلم برداشتہ لکھتا چلا جاؤں قواعد و چستی عبارت کی پروا نہ کروں۔

اگر کوئی شخص تنقید کی نظر سے میری کتابوں کو دیکھیگا تو اسکو ایک حیرت خیز بات محسوس ہوگی کہ میں نے بہت محدود الفاظ سے یہ سب کام لئے ہیں۔ یعنی میری زبان پر گنتی کے چند الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ انہی سے میں نے کام لیا۔ اور ہر قسم کے مضامین ادا کردئے۔ الفاظ کی وسعت میرے ہاں نہیں ہے۔ اور حافظہ درست نہ ہونے کے سبب مجھکو مقررہ و معلومہ الفاظ کی سوا ادائے مطلب کے وقت اور کوئی لفظ یاد نہیں آتا اور میں اپنے ہی محدود الفاظ سے ہر مطلب کو ادا کردیتا ہوں۔ پھر اگر میری عبارت میں الفاظ کی تکرار ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔

ایک اور وجہ

تکرار الفاظ اور غیر موثر عبارت کی یہ ہے کہ اب میں زیادہ تر کام کی باتیں لکھتا ہوں خیالی مضمون آفرینی نہیں کرتا۔ اور میری حالت

ابتدا سے یہ ہے کہ علمی مضمون یا کسی مادی واقعہ نویسی کے وقت عبارت کا زور قائم نہیں رکھ سکتا۔ خیال جذبہ کے مضامین میں خود بخود اور بے ساختہ چستی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک برس سے کوئی کتاب نہیں لکھی

سنہ ۱۹۱۸ء کے آخر سے کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی۔ حالانکہ پہلے ہر مہینہ ایک کتاب تیار ہو جاتی تھی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک ماہوار رسالہ مرشد کے نام سے جاری کیا تھا۔ چھ مہینے اسمیں اس قدر مصروفیت رہی کہ دوسرا کام نہ کر سکا مجبوراً اسکو بند کر دیا اور سابقہ مشغلہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اب کئی کتابیں اور شائع ہوئی ہیں۔ تسکین احساس۔ امام الزماں کی آمد۔ اولاد کی شادی۔ بہادر شاہ کا مقدمہ فاطمی دعوت اسلام۔ غلامانچہ برخسار یزید۔ محاصرہ دہلی کے خطوط۔ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ غدر دہلی کے اخبار۔ غالب کا روزنامچہ غدر۔ مرشد کو سجدہ تعظیم۔ گورنمنٹ اور خلافت۔

تصنیف کی مشکلات

عام مصنفوں سے میری حالت میں بہت فرق ہے غالباً کسی مصنف کو ایسے پراگندہ کام نہ کرنے پڑتے ہونگے۔ جو مجکو گھیرے رہتے ہیں۔ چالیس پچاس خطوط روزانہ کے پڑھنے جواب لکھنے لکھوانے میں بہت وقت درکار ہوتا ہے۔ خط لکھنے والے بارہ بارہ اور سولہ سولہ صفحہ کے خط بھیجتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو جواب لکھنے کے لیے بیکار بیٹھا رہتا ہوں۔ مجکو تو ان طویل خطوط کے پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ تاہم اپنا فرض سمجھ کر سب کو پڑھتا ہوں اور جواب لکھتا یا لکھواتا ہوں۔ مگر جواب کے اختصار کو دیکھکر لوگ ناراض ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ بھی امیر حمزہ کی داستان کی طرح خرافات سے لبریز ہو۔

میں نے ہر مرید کو پابند کیا ہے کہ اپنے حالات سے مجکو آگاہ کرتا رہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہو کہ میں بھی ہر مرید کو اپنے حال سے مطلع کیا کروں۔ مجکو آگاہ رہنے کی

ضرورت ہے کہ میں مریدوں کے نیک و بد حالات کا خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔ انکو جو دینی و دنیاوی واقعہ پیش آئے تو وہ مجکو لکھیں۔ تاکہ میں ان کے لیئے دعا کروں یا مناسب معلوم ہو تو مشورہ دوں۔ اور اگر جواب دینے کی کوئی بات نہ ہو تو خاموش ہو جاؤں۔ مگر مرید یہ سمجھتے ہیں کہ ہفتہ واری رپورٹ مجکو بھیجیں۔ اور پھر ہفتہ واری رپورٹ کے ہر حصہ کا ان کو جواب دیا جائے۔ یہ کیسا مشکل کام ہے۔ ساٹھ ہزار مریدوں میں اگر دس ہزار بھی جواب کی توقع کریں تو مجکو ایک بڑا عملہ جواب دینے کے لیئے۔ رکھنا پڑے۔ اور میں خود بھی سارا دن اسی کام میں لگا رہوں۔ میں جواب نہیں دیتا اس واسطے کہ جواب کی کوئی بات نہیں ہوتی تو وہ رنجیدہ ہوتے ہیں اور میری خفگی کا قیاس کر کے معافیاں مانگتے ہیں۔ اور اس سے میرا کام بڑھتا ہے۔ اور تصنیف کے لیئے وقت نہیں بچتا۔

میں لکھ دینا چاہتا ہوں کہ مریدین مجکو اپنے حالات سے مطلع رکھیں مگر جواب لینے کا خیال ترک کر دیں۔ اور طویل خط کوئی نہ لکھا کرے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ صبح سے شام تک تعویذ مانگنے والے گھیرے رہتے ہیں۔ ہر چند میں نے وقت مقرر کر دیا ہے پھر بھی لوگ نہیں مانتے اور وقت ضائع کرتے ہیں۔ مجبوراً زنانہ مکان میں ہر وقت بند رہتا ہوں۔ مگر تعویذ طلب عورتوں سے چھٹکارا وہاں بھی نہیں ملتا۔ وہ اندر گھس آتی ہیں۔

شہرت یافتہ آدمی کو دید کا شوق ایک دوسرا وبال ہے۔ سیکڑوں آدمی خواہ مخواہ چلے آتے ہیں۔ پوچھیئے مجھ سے کوئی کام ہے تو کہتے ہیں۔ جی کچھ نہیں محض آپکے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ بہت اچھا اشتیاق پورا ہو گیا۔ اب آپ تشریف لے جایئے مگر وہ اس طرح جم کر بیٹھ جاتے ہیں گویا وہ میرا قلمی فوٹو اتارتے ہیں یا میں نے اپنا گھر ان کے پاس گروی رکھا ہے یا مجکو ان کا کچھ قرضہ دینا آتا ہے۔ کسی طرح ان کا اشتیاق پورا نہیں ہوتا۔ کچھ کہتا ہوں تو کج خلقی ہے۔ چپ رہتا ہوں تو وقت اکارت جاتا ہے۔

تیسرا غلبان سفارش چاہنے والوں کا ہے۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ ایک نہ ایک صاحب تشریف لے آتے ہیں کہ فلاں مرید کو سفارشی خط لکھدو۔ نوکری مل جائے۔ قرضہ حاصل ہو جائے۔ بیٹی کی شادی کے لیئے مدد ملے۔ اسوقت دو مشکلیں ہوتی ہیں۔ ایک سفارش لکھنے کی جسکو میں پسند نہیں کرتا۔ دوسرے وقت ضائع ہونے کی۔

تیسرے اخباروں اور رسالوں کے مضمون مانگنے والے ناک میں دم کرتے ہیں۔ ہندوستان میں دستور ہو گیا ہے جسکو کوئی کام نہ آتا ہو وہ اخبار یا رسالہ جاری کر دیتا ہے پھر سیکڑی یہ ہوتی ہے کہ مضمون نگار اس کے رسالہ کو پر کریں۔ طرح طرح کی خوشامدیں کرکے طرح طرح کی دھمکیاں دیکر طرح طرح کے توڑ جوڑ سے مضمون مانگے جاتے ہیں۔ اوسط لگائی جائے تو ہر روز ایک نئی فرمایش مضمون کی آتی ہے۔

خدا اس سے زیادہ طاقت دے خان بہادر مولوی میرزا سلطان احمد صاحب کو جو مضمون لکھنے کی مشین ہیں کہ ملازمت کا مشکل کام بھی انجام دیتے ہیں۔ اور تمام ہندوستان کے رسالوں میں مضمون بھی لکھتے ہیں ان کا یہ کمال ناقابل یقین ہے کہ طلب مضمون کا خط پہنچتے ہی تیسرے دن ایک طول طویل اور بہت عالمانہ مضمون آجاتا ہے۔ میں نے ہر رسالہ والے سے سنا ہے کہ جب ہمنے ان سے کچھ مانگا ہمیشہ انہوں نے دیا۔ اور وہی دیا جو مانگا۔

مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اور بہت کم فرمایشوں کی تعمیل کر سکتا ہوں تاہم اور لکھنے والوں کی نسبت بہت لکھتا ہوں۔ اور اکثر رسائل میں میرے مضامین جاتے ہیں ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تصنیف و تالیف کا حرج ہوتا ہے۔

میں کتنا کام کرتا ہوں

اگر کوئی مجھکو کام کرتا دیکھے تو میرے ناتواں جسم اور روز روز کی بیماری کا خیال کرکے حیران رہ جائے کہ میں کیونکر اتنی محنت کر سکتا ہوں۔ اور کس طرح میرے اوسان چاروں طرف کی بے تکی یورش اور جاہلانہ ہل چل میں سلامت رہتے ہیں اور میں سب کے ساتھ اخلاق نرمی کا برتاؤ کر سکتا ہوں

چار بجے صبح سے لے کر دن گیارہ بجے رات تک مجکو ایک سکنڈ کی ایسی فرصت نہیں ملتی جس کو میں فرصت کہہ سکوں۔

واحدی صاحب اور بہیا احسان تعجب کرتے ہیں کہ میں پراگندہ بات چیت اور لوگوں کے ذاتی جھگڑوں میں مصروف رہ کر کیونکر مضامین اور کتابیں لکھ لیتا ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی وجہ سے مضامین اور کتابیں پہلے کی طرح دلچسپ اور اچھی عبارت میں نہیں ہوتیں۔

میرا دل اس سے خوش ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی مخلوق کے جو کام میرے سپرد کیئے ہیں ان کو ادا کرنے کی صلاحیت اس نے دی۔ اسواسطے میں زیادہ گھبراتا نہیں اور سب کو برداشت کرتا ہوں۔ مجھے بیوی بچوں اور دنیا کی خوشیوں سے لطف اٹھانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ میرے بچے شفقت پدری کا مزا نہیں جانتے اور ڈھائی سالہ لڑکا حسین جب میرے سامنے آتا ہے تو کچھ دیر کھڑا ہو کر اور یہ دیکھ کر کہ میں نے اسکی طرف توجہ نہیں کی تام تام کہتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ اور اماں سے جا کر کہتا ہے۔ ابا تام یعنی ابا کام کر رہے ہیں۔ اور مجھ سے بات نہیں کرتے۔

قصہ مختصر میری حالت دوسرے مصنفوں سے بالکل جداگانہ قسم کی ہے۔ اور میں جو کچھ لکھ لیتا ہوں میرے خیال کی موافق یہ بھی بسا غنیمت ہے۔

میری اچھی بری خصلتیں

انسان کو اپنے عیب بہت کم نظر آتے ہیں۔ مگر میری عادت ہے کہ میں اکثر اوقات اپنے عیبوں کو سوچا کرتا ہوں۔ اور اچھی خصلتوں کو بھی یاد کرتا ہوں۔ تاکہ اچھی بری خصلتوں میں تمیز کر سکوں۔

خود پسندی

سب شاعروں۔ انشا پردازوں علمی کام کرنے والوں میں خود پسندی کا مادہ ہوا کرتا ہے اور وہ اپنے سامنے کسی کی لیاقت و قابلیت کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ مجھ میں یہ عیب زیادہ تو نہیں ہے مگر تھوڑا بہت اس کا اثر اپنے اندر پاتا ہوں۔ سارا جہان کچھ ہی کہے اپنے مریدوں یا دوستوں کی زبان سے کسی دوسرے

لکھنے والے۔ یا کسی صاحب کمال یا درویش کی تعریف مجھکو ناگوار ہوتی ہے۔ اور مجھکو وہ قریبی دوست بہت برے معلوم ہونے لگتے ہیں جو میرے کسی خاص کمال سے دوسرے کے کمال کو بڑھا کر بیان کریں۔ واحدی صاحب سے میں بارہا ناراض ہوا ہوں جبکہ انہوں نے ایسا کیا۔ میں نے ہزاروں مرتبہ ان کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث سنائی ہے جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ تیرا دوست وہ ہے جو تیری بات کو دوسروں کی باتوں سے اچھا سمجھتا ہو۔ اور جو تیری مرضی کو دوسروں کی رضامندی سے مقدم جانتا ہو۔ اور جو تیری صحبت کو دوسروں کی صحبت سے کافی سمجھتا ہو۔

جب کبھی ان باتوں کے خلاف ان کا عمل میں دیکھتا تھا ان سے خفا ہو جاتا۔ اور مہینوں بات نہ کرتا۔

میں پسند نہیں کرتا کہ جو لفظ میرے اعزاز کا اخبار و رسالے میں لکھا جائے اس میں کوئی اور بھی شریک ہو۔ واحدی صاحب مجھکو حضرت لکھتے ہیں اور جب کبھی کسی اور کو وہ حضرت لکھدیں تو مجھکو ناگوار ہوتا ہے۔ مگر وہ اکثر بھول جاتے ہیں اور میری ناراضی کا شکار ہوتے ہیں۔

یہی حال مریدوں کے ساتھ ہے کہ جس طرح میں ان کو اپنا سمجھتا ہوں میری خواہش رہتی ہے کہ وہ بھی میرے سوا کسی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔

پیر مرید کے تعلق میں تو میرا یہ جذبہ بزرگوں کی تلقین کے موافق ہے۔ کیونکہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ اپنے پیر کے سوا (خواہ وہ کیسا ہی ہو) کسی دوسرے پیر سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھو۔ لیکن پیری مریدی کے باہر اس خود پسندی کی عادت کو میں عیب سمجھتا ہوں۔ اور یہ میرے کیرکٹر کا نقص ہے کہ کیوں دوسروں کے اچھے کمال کا اعتراف برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ایک قسم کا رشک و حسد ہے۔ خدا اس سے مجھے پاک کر دے۔ مگر سچ یہ ہے کہ اب تک تو یہ خرابی میرے اندر موجود ہے۔

خوشامد پسند

اب مجکو اتنا تجربہ ہوگیا ہے کہ خوشامد اور واقعی تعریف کو فوراً سمجھ لیتا ہوں۔ مگر پھر بھی کیرکٹر کی کمزوری سے خوشامد میرا دل خوش کردیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سامنے والا جھوٹی خوشامد کررہا ہے۔ مگر میرے دل میں خوشامدی پر مہربانی پیدا ہوجاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ بشریت کا اثر ہے۔ اور اس سے بچنا میرے امکان میں نہیں ہے۔ تاہم روزروز کے غور کرنے سے اب یہ عادت مجھ سے کم ہورہی ہے۔ اور میں زیادہ غیر واجبی خوشامد کی کچھ پروا نہیں کرتا ۔۔

مروت کی افراط

مجھ میں مروت سے دب جانے اور خلاف ضمیر کام کرلینے کی بہت بری عادت ہے۔ مثلاً ایک شخص آن کر عاجزی سے کہتا ہے کہ فلاں بات کی سفارش لکھدو اس سے میرا فائدہ ہوگا۔ دوسرے کا فائدہ دیکھکر اور اسکی مروت سے مغلوب ہوکر میں بلاتصدیق سفارش لکھدیتا ہوں ایک اعتبار سے یہ اچھی بات ہے کہ سفارش کرنے سے ایک غرض مند اور ضرورتمند کی امداد ہوتی ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے عیب ہے کہ میری قوت خودداری اس مطالبہ کا انکار نہیں کرسکتی اور مروت سے دب جاتی ہے۔

میں چاہے اسکی اصلاح نہ کرسکوں کہ اب یہ عادت جم چکی ہے لیکن دوسروں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو اس کمزوری سے بچائیں ۔۔

رائے کی بے استقلالی

میں رائے و ارادہ کا کچھ بہت مضبوط نہیں ہوں جب تک ذرا بھی رنگ کسی کام کا نہ ہو مجھکو ڈر رہتا ہے کہ میری رائے بدل نہ جائے۔ اور ذرا سی موثر اور مدلل تقریر و تحریر سے میرا خیال پلٹ جاتا ہے جس سے میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہوجاتا ہوں۔ اور دوسروں پر بھی اسکا اثر پڑتا ہوگا۔ اسکی وجہ میرے خیال میں یہ ہے۔ کہ قدرت نے میرے دل و دماغ کو فوری تاثر

کا مادہ بہت دیا ہے۔ اسی وجہ سے معمولی اور رکیک باتوں پر میں عمدہ عمدہ مضامین لکھ لیتا ہوں کہ دماغ کا تاثر سب سے نرالا ہے۔ پس جب میرے سامنے موثر انداز سے کسی خیال و رائے کی تردید کی جاتی ہے تو دماغ کا تاثر اسکو فوراً قبول کر لیتا ہے اور میری رائے بدل جاتی ہے۔ میں اسکو اپنا سب سے بڑا نقص سمجھتا ہوں اور اسکو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اب میرا خیال ہو کہ پہلی زیادتی میں کمی ہو گئی ہے۔

ضد اور ہٹ

راج ہٹ۔ بالک ہٹ۔ تریا ہٹ مشہور ہے۔ میں نہ راجہ ہوں نہ بچہ ہوں۔ نہ عورت ہوں مگر میرے اندر ضد اور ہٹ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اور اسکو بعض حالات میں برا سمجھتا ہوں۔

باوجود رائے کی بے استقلالی کے ضد کا یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اسپر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو اس سے دست بردار نہیں ہوتا اور اسپر اڑا رہتا ہوں۔

ایک دفعہ واحدی صاحب سے ناراض ہوا اور دل میں ٹھان لیا کہ ایک برس تک ان کے گھر میں نہ جاؤں گا۔ پھر سب ہی کچھ ہوا مگر سال بھر تک میں نے ان کے گھر میں قدم نہ رکھا وہ خود میرے پاس آتے رہے۔ اور کسی تیسرے آدمی کو یہ محسوس نہیں ہوا کیونکہ میری بات چیت میل جول میں فرق نہ تھا صرف گھر کے اندر نہ جاتا تھا۔

جب میں کسی سے ناراض ہوتا ہوں تو خط میں اسکا نام نہیں لکھتا اسکا تجربہ بھی سوائے واحدی صاحب کے کسی کو نہیں ہوا۔ اور جب ان کے پاس بے نام کا خط جاتا ہے تو وہ میری خفگی کو سمجھ جاتے ہیں۔ اسی حال میں پرچی احمد آبادی کو بھی اسکا تجربہ کرنا پڑا۔ جنکو تین ہفتہ میں بے نام کے خط لکھے۔ اور جس دن یہ مدت ختم ہوئی وہ بہت ہی خوش ہوئے۔

میرا خیال ہے یہ ضد اور ہٹ بچوں کی سی حرکت ہے۔ اور کوئی خوبی نہیں ہے اور میں اسکو عیب سمجھتا ہوں۔ تاہم چونکہ مجھ میں ہے اسواسطے لکھ دیا۔

سنگدلی

خود مجھکو کوئی حادثہ پیش آئے یا قریبی دوست و مرید کو تو میں اس کے اصلی صدمہ کو بہت کم محسوس کرتا ہوں۔ اور غم سے مجھے رونا نہیں آتا۔ صرف محبت کے قصہ یا واقعہ سے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں میں نے ایک دفعہ لکھا تھا غم کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ میرے دل کی سچی تصویر تھی۔ میری بیوی مر گئیں۔ دو لڑکے مر گئے۔ لڑکی مر گئی۔ مگر میرے دل پر ان کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

گو میں اپنے احباب کے صدمات میں سچے دل سے شریک ہوتا ہوں۔ انکی ہمدردی بجا لاتا ہوں۔ مگر میرے دل پر غم کا وہ اثر نہیں ہوتا جس سے دوسرے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ بات اچھی ہے کہ میرا دل ایک ہی رخ ہے۔ اور وہ خدا ہے۔ باقی مخلوق کے تعلقات کی طرف مجھکو رغبت نہیں ہے۔

لیکن دنیا عالم اسباب ہے یہاں غم و الم سے متاثر ہونا شان آدمیت ہے۔ اور جسمیں یہ بات نہو تو میں کہوں گا کہ یہ اس کا نقص ہے۔ اور سنگدلی کا عیب اس پر صادق آئے گا۔

قناعت

کھانے پینے میں۔ رہنے سہنے۔ چلنے پھرنے میں مجھکو قناعت پروری ہے۔ اگر بہت مکلف کھانا ملے تب بھی خوشی سے کھا لیتا ہوں اور بہت معمولی ملے تب بھی بلا کسی حس تکلیف کے خوش ہو کر کھاتا ہوں۔ اس مضمون کے لکھتے وقت ۲۷ رمضان ۱۳۵۲ھ کو مہمان زیادہ آگئے اور کھانا کچھ نہ بچا تو میں نے روزہ دار پکانے والوں کو دوبارہ پکانے کی تکلیف نہ دی اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا لیئے۔ اور آرام سے پڑ کر سو گیا۔ حالانکہ ایک رات پہلے ۲۶ رمضان یوم پنجشنبہ کو خواجہ بانو نے بہت مکلف کھانے کھلائے تھے۔

ایک دفعہ خان بہادر حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کے ہاں مہمان تھا جب ان کے گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور کھانا تیار ہونا دشوار

معلوم ہوا حضرت اکبر کچھ متردد تھے کہ کیا بندوبست کروں۔ میں نے کہا بازار سے دو پیسہ کی روٹی اور ایک پیسہ کے کباب منگا دیجئے بس یہی کافی ہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور میں نے خوشی خوشی اس سے بھوک کا پیٹ بھر دیا۔

لباس میں بھی میرا دل غنی رہتا ہے۔ جیسا بھی مل جائے پہن لیتا ہوں اور کسی وقت مجھے اچھے کپڑے کی تمنا نہیں ہوتی۔ بیوی بچوں کو اس عید سنہ ۱۳۴۶ھ کے لیے نئی جوتیاں نئے جوڑے۔ دو سو روپے سے زیادہ کے میں نے بنوا کر دیئے ہیں۔ مگر اپنے لئے ایک پائی کا بھی کچھ نہیں بنوایا۔ وہی پرانی جوتی ہے۔ وہی پرانے کپڑے ہیں۔ اور وہی میرا مسرور دل ہے۔ اسمیں بخیلی و کنجوسی کچھ نہیں ہے۔ بلکہ دل کی ایک حالت ہے کہ وہ اپنی زیبایش و آسایش کا کبھی خیال نہیں کرتا۔ اور یہی قناعت ہے جسکو میں خدا کے شکر کے ساتھ ایک اچھی خصلت سمجھتا ہوں۔ سواری موٹر ہو۔ لینڈو ہو۔ تانگہ ہو۔ یکہ ہو۔ بیل گاڑی ہو۔ ٹھیلہ ہو سب مجھکو برابر ہیں۔ پیدل بھی بے تکلف پانچ چھ کوس چلا جاتا ہوں اور عموماً درگاہ سے دہلی تک پیدل جانا ہوتا ہے۔

ہمدردی

میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خدا جو کچھ مجھے دیتا ہے اسکا بڑا حصہ مستحق غربا کو بانٹ دیتا ہوں۔ میرا ذاتی خرچ اور بیوی بچوں کا خرچ ایک سو روپے ماہوار کے اندر رہتا ہے۔ اور تمام خرچ کی اوسط تین چار سو روپے ماہوار کی ہے۔ جو سب مستحق غریبوں کی نذر ہوتا ہے۔

میں دروازہ پر بھیک مانگنے والوں کو آدھا ٹکڑا روٹی کا نہیں دیتا کیونکہ میرے خیال میں یہ لوگ خیرات کے مستحق نہیں ہوتے۔ بلکہ محتاج عورتوں۔ یتیم بچوں۔ بیوہ اور کمانے کے ناقابل مستورات کو دیتا ہوں یا تعلیم حاصل کرنے والوں کی اعانت میں صرف کرتا ہوں میرا عقیدہ ہے کہ محنت کرنے والے کو اجرت سے کچھ زیادہ بطور انعام کے دینا خیرات میں شامل ہے کیونکہ محنت کرنے والے کو اس انعام سے محنت کی طرف رغبت ہوتی ہے۔

اور دنیا سے کاہلی و بیکاری کا اثر دور ہوتا ہے۔ میں غریب لوگوں کو تجارت کرنے کے لیئے یا پیشہ کرنے کے لیئے امداد دیتا ہوں۔ مگر اہلی کو بھی کی نسبت مجھے یقین ہوتا ہے کہ واقعی یہ تجارت کریں گے یا پیشہ و صنعت کو اس امداد سے سہارا ملیگا۔ میرے عقیدہ میں خدا انہی کاموں کی برکت سے مجھکو ضرورت سے زیادہ دیتا ہے۔ میں کوئی چیز جمع نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ و سرکاری ٹیکس سے میں محفوظ ہوں۔ میری بیوی کے پاس سولے دو بندوں کے کچھ زیور نہیں ہے۔ البتہ میری لڑکی کے پاس زیور ہے۔ جو اس کی مرحومہ والدہ کا ورثہ ہے۔

مہمان کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور اکثر اوقات میں بھوکا سوتا ہوں اور سب کچھ مہمانوں کو کھلا دیتا ہوں۔

یہ خودستائی کے لیئے نہیں بلکہ پیرزادوں کی تلقین کے لیئے لکھا جاتا ہے تاکہ وہ اسی طرح عمل کیا کریں۔ اور اسی واسطے یہ حال لکھا گیا ہے۔

غریبوں سے محبت

مجھے غریبوں اور کمینوں سے اتنی محبت ہے کہ شاید ہم اور بالشویک جماعتوں کا نام سننے سے پہلے میں نے بہت کچھ ان کے لیئے لکھا ہے۔ اور عمل کر کے دکھایا ہے۔ میں چمار، ڈوم، حلال خور دل اور سب گندے اور کمین لوگوں میں اس طرح جاتا ہوں گویا ان کے خاندان کا ایک آدمی ہوں میں ان کے بچوں کو گود میں لیئے پھرتا ہوں۔ میں ان کی بیماریوں میں ایسی بیمارداری و خدمت کرتا ہوں گویا خود چمار حلال خور ہوں۔ میں راتوں کو ان کے جھونپڑوں میں بیٹھ کر ان کے بیماروں کے پاؤں دباتا۔ اور دوائیں پلاتا اور کھانا کھلاتا ہوں۔ مجھے ان کا بڑا بننا مقصود نہیں ہے۔ نہ ان کا بڑا بننے سے مجھے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو میری خصلت کا تقاضا ہے اور میں اس سے بہت ہی خوش ہوں۔ اور اس پر خدا کا شکرانہ بجا لاتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسا دل دیا۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے بھی ایسا کریں۔ ان چند خصلتوں کے اظہار سے میرے کیرکٹر کا سمجھنا آسان ہوگا۔ اب میں اور کچھ لکھتا ہوں۔ جس کا تعلق میری زندگی سے ہے۔

میرے مصلح

میرے استاد۔ اور والدین سب سے بڑے مصلح سمجھے جاتے ہیں مگر مجھ کو ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مصلح نظر آتے ہیں۔ جن کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے والدین کی اصلاح سے میں نے بہت کم فائدہ اٹھایا کہ وہ دونوں مجھ کو خورد سال چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ استادوں میں مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم خلف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھ کو تعلیم کے ساتھ ہی تربیت بھی کیا جن کی تربیت کے اثر سے اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کا اثر مجھ میں پیدا ہوا۔

دوسرے مصلح خاکسار صاحب ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جو سب سے بڑے نگران اور مصلح میری زندگی کے ہیں۔

تیسرے مصلح حضرت اکبر الہ آبادی ہیں۔ ان کی خدمت میں میری حاضری اتنی زیادہ ہوئی ہے کہ شاید ان کا کوئی دوسرا شناسا بمشکل اس کثرت سے ان کے پاس گیا ہوگا ان کی صحبت نے۔ ان کی گفتگو نے۔ انکی نصیحت نے ان کی خط و کتابت نے۔ ان کے کلام نے۔ اور ان کے باطنی اثر نے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے اور جس کو میں ہر وقت اپنے ساتھ سمجھتا ہوں میری زندگی کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔

اب میں ان کی زبان سے بولتا ہوں۔ ان کے دماغ سے سمجھتا ہوں۔ اور سمجھاتا ہوں۔ ان کے دل سے میری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ان کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ اور ان کے احساس سے ہر شے کو محسوس کرتا ہوں۔ میری امید ان میں ہے۔ انکی نوید مجھ میں ہے آج ان کا جسم الہ آباد کی عشرت منزل میں ہے۔ اور کل وہ وجود میری قبر کے سرہانے مدفون ہوگا۔ اگر قدرت کے نوشتہ نے اجازت دی تو میں قیامت تک درگاہ حضرت محبوب الٰہی کے

گوشہ میں درویش خانہ حلقۂ المشائخ کے شمال میں حضرت اکبر الہ آبادی کے پائینتی قبر بنا کر آرام کروں گا۔ تاکہ میری ابدی زندگی اس ازل کے حرف سے وابستہ رہے۔ (افسوس ایسا نہ ہوا اور حضرت اکبر الہ آباد میں دفن ہوئے)

معنوی اور روحانی قوتیں میرے عقیدہ کی موافق انسانوں کی زندگی مرتب کرتی اور ان کی رہنما بنتی ہیں۔ میری زندگی کی تربیت اور خیالات و اعمال کی رہنمائی و اصلاح کا ایک بڑا حصہ حضرت اکبر الہ آبادی کی روحانی معنوی قوتوں سے ہوا ہے۔ اور خدا نے میری طبیعت میں ایک غیبی اور ازلی مناسبت ان کے خیالات و جذبات و احساسات سے دی ہے کہ جو ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے بغیر ان کے اظہار و اعلان کے میرے دل میں بھی خود بخود وہی لہر ظاہر ہوتی ہے۔ اور میں اس کی رہنمائی میں تقریر و تحریر کا عمل کرتا ہوں۔ میں ان کی ہر باطنی نعمت کا وارث ہوں اور وہ میری اکثر ظاہری و باطنی حالتوں کے مرشد ہیں۔

چوتھے مصلح

نواب غلام نصیر الدین خان صاحب رئیس شیخ پورہ ضلع میرٹھ جو عرصہ دراز سے دہلی میں مقیم ہیں۔ اور میں سالہا سال زندگی کے دور اول میں ان کے ساتھ رات دن رہا ہوں میں یہاں ان کے احسانات کا ذکر نہیں کرتا جو انہوں نے مجھ پر کئے اور جن سے میرا بال بال بندھا ہے۔ بلکہ انکی صحبت نے جو اصلاح میری کی اسکو لکھنا میرا مقصود ہے۔

نواب صاحب سلسلہ نظامیہ کے متوسل اور درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے خاندانی حلقہ بگوش ہیں اور انہیں ادب و عقیدت کا وہ مکمل نمونہ موجود ہے جو پہلے زمانہ کے مریدوں میں ہوتا تھا وہ قدیمی اور مشرقی امراء کی مکمل تصویر ہیں ان کے تمیز دار طرز بود و باش طعام خوری و آب نوشی سے میں نے شائستہ آدمیوں کی طرح کھانا پینا پہننا۔ بولنا چالنا اور دوسروں سے برتاؤ کرنا سیکھا ان کی خلقی شائستگی کے علم نے مجھکو آدمیت سکھائی۔

پانچویں اصلاح

ہندوستان کے بے شمار بے وقوف اور عقل سے بے بہرہ آدمی تھے جب میرے مضامین اخبارات میں چھپنے شروع ہوئے۔ میری ایک نامور درگاہ سے نسبت لوگوں کو معلوم ہوئی تو احمقوں کا ایک پل ٹوٹ پڑا۔ ایسے عجیب و غریب عقائد میری متعلق ظاہر ہونے شروع ہوئے کہ اگر خاکسار صاحب کی رکھا تھام نہ ہوتی اور بزرگوں کا باطنی تصرف حامی کار و پشت پناہ نہ ہوتا تو میرے گمراہ ہو جانے اور خدا۔ رسول۔ امام۔ مسیح۔ مہدی۔ بن جانے یا اسی قسم کے دعوے کر بیٹھنے میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔ میں خود دعوی نہ کرتا تھا۔ لوگ خط لکھ لکھ کر اور ملاقاتیں کر کر کے مجھکو اپنی جہالت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے تھے۔ یعنی ایسی حرکات اور ایسے عقائد ان کے میں دیکھتا اور سنتا تھا کہ نفس مجھکو فریب دیتا تھا کہ یہ سب احمق ہیں اور احمقوں سے فائدہ اٹھانا ایک عقلمند پر فرض ہے (جیسا کہ بعض ناموسینے ہوئے فرضی مقتداؤں کی مخفی صحبتوں میں سنا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک دنیا میں احمق موجود ہیں ہم عقلمند آسانی سے روٹی کھاتے رہیں گے) مگر خدا تعالی کا شکر ہے کہ اس نے مجھکو ان خوش عقیدگیوں کے دھوکے سے بچایا اور میں ویسا ہی ناچیز بندہ بنا رہا جیسا کہ تھا اور جیسا کہ ہوں۔ اور جیسا کہ رہونگا۔ بلکہ ان بے وقوفوں کو بار بار آزمانے سے میرے خیالات کی اصلاح ہوئی۔ اور میں نے دنیا میں رہنے والوں سے دنیا برتنے کی عقل سیکھی۔ اسواسطے میں ان کو اپنا مصلح سمجھتا ہوں اور دلی شکر ہے کے ساتھ ان حمقان عقل آفرین کا احسان ذکر کرتا ہوں

چھٹے مصلح

تنگی۔ بےکسی۔ مفلسی۔ اور مصیبت کے ایام ہیں۔ اگر میں بچپن میں یتیم و اسیر نہ ہو جاتا اگر ابتدائی عمر میں مجھ پر بےکسی اور مصیبت کا بوجھ نہ پڑتا تو کبھی میری اتنی اصلاح نہ ہوتی جتنی ہوئی۔

دل کا ٹوٹ جانا۔ سہاروں کا ہاتھ سے چھوٹ جانا انسان کے لئے ایک نعمت ہے اور اس سے اس کے اندر خود اعتمادی اور سلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنا) اور خود شناسی

پیدا ہو جاتی ہے۔

میں تو کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں نہ میں نے کوئی بڑا کام اب تک کیا ہے لیکن ایک کامیاب آدمی ضرور ہوں۔ اور مشکلات زندگی پر میں نے بفضل خدا پوری فتح پائی ہے اس واسطے لکھتا ہوں کہ میری کامیابی کے اسرار میں شکستہ خاطری بھی ایک راز تھا۔

دنیا میں ہر کامیاب اور بڑا آدمی عموماً یتیم ہوا ہے۔ آنحضرت صلعم یتیم تھے حضرت علی یتیم تھے۔ حضرت غوث الاعظم یتیم تھے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر یتیم تھے حضرت محبوب الٰہی یتیم تھے۔ حضرت خواجہ اجمیری یتیم تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی یتیم تھے۔ ملک کے فاتح بھی عموماً یتیم اور بے کس گزرے۔ اس آخر زمانہ کا مشہور فاتح نپولین بونا پارٹ بھی یتیم و مفلس تھا۔

اگر انسان اپنی مصیبتوں کے ایام میں یہ خیال رکھے کہ یہ آفات و پریشانیاں اس کی زندگی کی مصلح ہیں اور اسکو مردانہ وار ہمت و سعی و عمل سے ان کا مقابلہ کرنا چاہئے تو اسکو بہت تسلی ہوگی اور وہ اطمینان سے ان کا مقابلہ کرکے فتحمندی حاصل کرلے گا۔

ساتواں مصلح میرا جذبہ اطاعت اور شوق عمل تھا۔ مجھکو جو مفید مشورہ دیا گیا میں نے اسپر غور کیا۔ اور اطاعت کیساتھ اسپر عمل کرنے کی کوشش کی اگر میں خودسر اور خود رائے ہوتا تو کبھی زندگی کی بلاؤں سے نکلکر زندگی کی نعمتوں میں نہ آسکتا۔ یہ خدا کا تفضل تھا کہ اس نے مجھ میں اطاعت و قبولیت کا مادہ دیا تھا۔

آخری مصلح میرا خدا تھا۔ کہ اول بھی اس نے اصلاح کی آخر بھی وہی مصلح ثابت ہوا۔ اسی کے فضل نے مجکو اقبال دیا کہ میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا کامیابی ہوئی۔ اور جس رخ کو میں نے قدم بڑھایا راستے کھل گئے اور میں آسانی سے منزل طے کرسکا۔

اول دن سے خدا کی ذات پر میرا اعتماد تھا۔ اور آج کے دم تک میں اسی کے فضل و

کرم پر توکل رکھتا ہوں اور اپنی کامیابی کو اس کا فضل سمجھتا ہوں۔

مریدوں کا پہلا دور

سب سے پہلے ریاست الور میں بابو فخر الدین نظامی مرحوم انجینیر نے مجھ سے بیعت کی۔ اور دیگر بہت سے لوگ بھی مرید ہوئے مولوی عمر دراز نظامی درگاہی شاہ ساکن سہارنپور جو پہلے مولوی جمال الدین صاحب دہلوی مرحوم کے مرید تھے اور اب مجھ سے حسن عقیدت رکھتے تھے اور جانے کے باعث ہوئے اور انہی کی ترغیب سے اہل الور نے مجھ سے بیعت کی تھی۔ مولوی عمر دراز بعد میں طالب ہوئے اور ان کو میں نے خلافت دی۔ اس زمانہ میں وہ ٹھیکہ داری کرتے تھے۔

اس کے بعد ریاست ریواں میں درگاہی شاہ ٹھیکہ داری کرنے لگے اور ان کی ترغیب سے میں وہاں گیا۔ اور بے شمار آدمیوں نے بیعت کی۔ اس کے بعد مسلسل کئی بار ریواں جانا ہوا۔ اور وہاں ایک بہت بڑی تعداد مریدوں کی ہو گئی۔ یہ سب غریب لوگ تھے۔ اور زیادہ تر سنگتراشی کا پیشہ کرتے تھے۔ مگر ان کی محبت و اطاعت کی وہ شان تھی جو بہت کم دوسری جگہ پائی جائے گی۔

ریواں کے سلسلہ میں الہ آباد کے محلہ کیٹ گنج میں جس قدر سنگتراشی پیشہ لوگ رہتے تھے وہ بھی مرید ہو گئے۔ اور انہیں نہایت درجہ کی محبت دیکھی گئی۔ اسی زمانہ میں حضرت اکبر الہ آبادی سے ملاقات ہوئی اور ان کے قرابتداروں میں بھی مریدی کا سلسلہ قائم ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ روزانہ خطوط کے ذریعہ سے اطراف ہند کے لوگ بیعت کی درخواست بھیجتے تھے۔ مگر میں نے ان کے یا کسی مرید کے نام لکھنے کی کوشش نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا مریدوں کے مجھ کو نام معلوم نہیں ہیں اور جب وہ مجھ کو لکھتے یا مجھ سے ملنے آتے ہیں تب معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط کے ذریعہ سے مرید ہوئے تھے۔

اس کے بعد مولوی رضی الحق صاحب رضوانی شاہ احمد آبادی نے بیعت کی اور ان کو خلافت دی گئی۔ احمد آباد میں اس کے بعد تیزی سے سلسلہ بیعت بڑھنے لگا۔

احمد آباد کے بعد میں حیدرآباد مسٹر حیدری ہوم سکریٹری کی دعوت پر گیا اور وہاں ڈاکٹر محمد قمر الدین ہلالی شاہ اور بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ اور سکندرآباد میں بھی سلسلہ کو رواج ہوا۔ اس کے بعد میں بار بار وہاں جاتا رہا۔ اور سلسلہ کو ترقی ہوتی رہی دوسرے سفر دکن کے موقع پر میں مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کا مہمان ہوا اور انہوں نے بھی سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں مجھ سے بیعت کر لی۔ اور تیسرے سفر میں ان کے سب بچے بھی مرید ہو گئے

بمبئی سے مہر بخش صاحب درزی دہلی آکر مرید ہوئے اور ان کے ذریعے سے اہل بمبئی میں مکتوبی درخواستوں سے سلسلہ پھیلتا رہا۔ منشی عبدالرزاق نظامی بھنڈارہ دہلی آکر مرید ہوئے۔ اور ان کی ترغیب سے متعدد لوگ ممالک متوسط سے دہلی آکر داخل سلسلہ ہوئے۔ پھر سہارنپور میں سلسلہ کی اشاعت ہوئی۔

محمد اشرف نظامی کشفی شاہ کے ذریعے سے صوبہ برہما میں سلسلہ کو بہت زیادہ فروغ ہوا۔ اور مدینہ منورہ جاتے وقت عدن میں بھی لوگ مرید ہوئے۔ غرض اسی طرح پنجاب۔ برہما۔ بنگال۔ دکن۔ گجرات کاٹھیاواڑ۔ یو۔ پی۔ سی۔ پی۔ وغیرہ میں نہایت سرعت و تیزی سے سلسلہ کو ترقی ہونے لگی۔

تمام مقامات ہند میں حسب ذیل میرے خلفاء ہیں :۔

صوبہ برہما میں کشفی شاہ۔ یو۔ پی میں مولوی عمر دراز درگاہی شاہ۔ گجرات میں مولوی حاجی علی میاں قریشی شاہ۔ دکن میں مولوی محمد نذیر سجادہ نشین کملی شاہ۔ اور القائی شاہ نامی کوہ سوار۔ اور مولوی عبدالشکور مرحوم اور مستری حکیم امیر الدین لقائی شاہ۔ اور سندھ میں مولوی شفیع محمد حقیقت شاہ۔ اور کشمیر میں پیر حسام الدین گیلانی شاہ اور مراد آباد میں مولوی عبدالرحمن صاحب خیابانی شاہ اور حکیم سید سبحانی نظامی محبوبی شاہ بھاگلپور میں مولوی عبدالحفیظ خاں نیکی شاہ۔

خلفاء کی خصوصیات | مذکورہ خلفاء تکمیل سلوک کے بعد اس درجہ کو نہیں پہنچے یہ اللہ

علاقوں کے مریدین کی نگہداشت کے لیے ان کو خلافت دی گئی ہے۔ انہیں سے مولوی گاڑی شاہ نے بڑا کام کیا ہے۔ ہزاروں مریدوں کو پکا نمازی بنا دیا اور انکی خدمت کی۔ اور کٹنی بنارس وغیرہ میں کثیر افراد کو اپنا مرید کر کے سلسلہ بڑھایا۔

درگاہی شاہ میں بے علم طبقہ کی خدمت و نگہداشت اور ان کو ضابطہ میں منسلک رکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے۔ اور وہ پرانی طرز کے طالب اللہ اللہ کرنے والے بوڑھے درویش ہیں۔

کشفی شاہ بہت ہونہار جوان ہیں۔ انہیں خدمت بنی آدم کا بہت جوش ہے۔ اور سلسلہ کی ترغیب کا خاص ملکہ ہے۔ اور مریدوں سے اتحاد و میل جول رکھنے کا شوق رکھتے ہیں انہیں قوت عمل بہت زیادہ ہے اور میں ان کو درگاہی شاہ کی طرح عملی اور کارگزار خلیفہ سمجھتا ہوں۔ مولوی محمد نذیر صاحب حیدر آبادی بھولے بھالے عابد اور سلوک کی منازل میں مصروف اور میرے مرغوب خلیفہ ہیں۔ مگر عملی قوت ان میں بالکل نہیں ہے۔ اور کن کے مریدوں کا ضابطہ ہاتھ میں نہیں لے سکے۔ مولوی عبد الشکور صاحب منزل رسیدہ اور سلوک کے کامل خلیفہ تھے مگر افسوس انکا انتقال ہوگیا۔ القانی شاہ خاندانی پیرزادہ اور انشا پرداز نوجوان ہیں۔ اور مجھے ان کی قابلیت سے خدمات سلسلہ کی بہت توقعات ہیں حکیم امیر الدین لقانی شاہ وغربا اور کم علم طبقہ میں دینی پابندی اور ترغیب سلسلہ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مولوی قربی شاہ احمد آباد کے مریدوں کے نگران اور ضابطے کے اندر کام کر رہے ہیں۔ خاندانی پیرزادے ہیں۔

پیر حسام الدین گیلانی خاندانی پیر ہیں۔ اور سلسلہ کو کشمیر میں فروغ دے رہے ہیں۔

شفیع محمد چشتی عقیدت شاہ سے مجھ کو بہت توقعات ہیں۔ کیونکہ سندھ میں اس لیاقت اور عملی قوت اور سچی محبت کا آدمی میں نے نہیں دیکھا (افسوس ہے ان کا انتقال ہوگیا)

مولوی حیا صاحب ایک دفتر میں ملازم ہیں۔ رذیلوں کی صورت ہے مگر تبلیغ و اشاعت اسلام کا وصف قدرت نے ان کو دیا ہے سینکڑوں غیر مسلم ان کے ہاتھ پر اسلام لا چکے ہیں

اصلاء رہے ہیں حکیم محبوب السبحان بہت عابد زاہد اور درویش صفت شخص ہیں۔ دکن میں ڈاکٹر قمر الدین ہلالی شاہ بہترین آدمی نگہداشت مریدین کے لئے میری نظروں میں ہیں مگر میں لکھنا نہیں چاہتا کہ ان کو کیا بتانا ہے۔ عملی قوت۔ محبت کا برتاؤ۔ سلسلہ کی شیرازہ بندی ان سے زیادہ بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے۔

دکن میں مہاراجہ۔ ہلالی۔ سید عبدالرحمٰن۔ غلام محی الدین اور موتی بیگم سرفراز اور اہالی طور خانہ سکندر آباد کو سب سے زیادہ اپنے قریب پاتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر ان سب سے زیادہ جن ورگی سچی محبت نے مجھ پر اثر کیا وہ میر تراب علیخان تحصیلدار اور ان کی بیوی امیرا بیگم مراد بانو ہیں۔ جو اخلاص و اطاعت۔ جو محبت۔ جو زندہ عمل احمد آباد کے مریدوں میں پایا جاتا ہے وہ کسی علاقہ کے مریدوں میں ایسی مجموعی حالت میں نہیں ہیں ان کو میں نے دل دیا ہے۔ اور انہوں نے میرا دل لیا ہے۔

مگر ریواں کے مریدوں کو احمد آباد کی محبت سے بھی بڑھ کر یاد کرنا چاہتا ہوں کہ احمد آباد والے مجھکو سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہیں۔ اور ریواں نے بے سمجھے مجھکو مانا ہے۔ اور اسکا درجہ سابقون الاولون میں ہے۔ بنوں کے مریدوں کی بیتاب محبتوں کی میں جس قدر ناز برداری کر سکتا ہوں یہ ثبوت ہے اسکا کہ مجھے ان کے خلوص کا پورا اقرار ہے الہ آباد والے اپنی محبت کے مسلسل اور پائیدار ثبوت دیتے ہیں۔ مگر خانگی نزاع کی حالت میں ان کو میں نے ایسا مطیع نہیں پایا جیسا کہ میرا دل چاہتا تھا۔ اور جیسے کہ اہل احمد آباد کو دیکھتا ہوں۔ پھر بھی وہ خانہ جنگی کے جوش کو میرے حکم پر قربان کرنے کی مثالیں دکھا چکے ہیں۔ غریب سہارنپور میرا ہے۔ اور اس کے جگر میں مجھکو طالب علمی کے دن گزارنے کا موقع ملا ہے۔ وہی سہارنپور جسنے مجھکو عبدالحق جیسا دھن کا پکا آدمی دیا۔ اور وہ گاجی شاہ صاحب جیسا کارگزار شخص یہاں سے نمودار ہوا۔ وارد محمد عمر اور شیخ عبداللہ اور سماۃ محبوبن کے خلوص کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ شیخ عبداللہ سے تو مجھکو وہ توقع ہے جو اس کوچہ میں پیروں کو مریدوں سے

ہوا کرتی ہے۔

سی۔ پی کے دانشمند اور کیسو تعلق رکھنے والے مرید کتنی ہی شکایت کریں کہ میں کبھی ان کے علاقہ میں نہیں گیا مگران کو یاد رکھنا چاہیئے کہ میرے دل نے ان کے دلوں کی اکثر مرتبہ سیر کی ہے۔

پنجاب میرے واسطے عالم خواب ہے۔ آنکھیں جو بیدار ہوا پوری طرح جاگا۔ برہما کی روشنی اسی پنجاب کے دم سے ہے۔

برہما۔ برہم عقل کی محبت کا مظہر ہے۔ گو تجارت وملازمت کے ابر میں چھپا رہتا ہے مگر میں اسکو جھانک جھانک کر دیکھ لیتا ہوں اور وہ تو کبھی میری طرف سے آنکھ نہیں پھیرتا۔

سندھ وکشمیر میرے دور مستقبل کے دروازے ہیں۔ وہاں جو آثار الفت کے نظر آتے ہیں وہ بشارتیں ہیں آیندہ وقت روشن کی۔ بنگال و بہار مشرقی پہلو میرے سلسلہ کے ہیں۔ اور ان میں تعلق کا نور چمک رہا ہے۔

راجپوتانہ جہاں سب سے پہلا علم میرا نصب ہوا تھا مجکو پکارتا ہے لیکن میں لبیک نہیں کہہ سکتا جب تک کہ حکم خداوند ہو۔

کاٹھیاواڑ میں بیگم صاحبہ والیہ ریاست مانا ودر اور بیگم صاحبہ منگرول اور بڑے بڑے ممتاز لوگ سلسلہ کے فداکار۔ اور گجراتی محبت کا قد آدم آئینہ ہیں مگر ان سب میں محمد بہاء الدین پیرشاہ لاہوتی خلف نواب صاحب والی ریاست مانگرول کو قلم بندی کے ہنر سے دل بند کرکے دکھانا چاہتا ہوں کیونکہ وہ کاٹھیاواڑ ہی کا بدر نہیں بلکہ میرے سلسلہ دل کا ماہتاب بننے والا ہے۔

زندگی کے تجربے اور مشاہدے

ہر شخص اپنی زندگی میں عجیب وغریب تجربے کرتا ہے۔ اور مشاہدات خاص سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ مگر یہ تجربے اور مشاہدے اسکی ذاتی فضلیتوں اور معلومات اور ذہن ودماغ

واحساس کی ہی کے موافق ہوتے ہیں۔ حکمراں لوگ سیاسی تجربوں اور مشاہدات میں مصروف رہتے ہیں۔ اوران کوان کی معاملات اور ذاتی دلچسپی پالٹیکس کے سوا زندگی سے اور کچھ سبق حاصل نہیں کرنے دیتی۔ مذہبی لوگ مذہب کے مشاہدات و تجربات زندگی سے اخذ کرتے ہیں یہی حال اور سب لوگوں کا ہے۔ کہ جیسے وہ خود ہوتے ہیں اسی قسم کے تجربے اور مشاہدات سے ان کو سابقہ پڑتا ہے۔ اوران کے تجربے اور مشاہدے ان کی ذاتی حالت میں محدود رہتے ہیں۔

یہ کچھ نامور اور بڑے آدمیوں پر موقوف نہیں ہے۔ ہر درجہ اور ہر قسم کے آدمیوں کو اس زندگی میں ایسے حالات پیش آتے ہیں جو پورا سرار افسانے معلوم ہوں اگران کو لکھا جائے۔ اوران حالات سے دوسرے ہدایت پائیں۔ اگر اس نیت سے انکو بیان کرنے یا سننے کی کوشش ہو۔

خدا نے ہر انسان کو خود اپنا بادشاہ۔ خود اپنا استاد۔ خود اپنا پیر۔ اور خود اپنا طالب اور خود اپنا مطلوب بنایا ہے۔ اگر وہ اپنی بادشاہی کے فرائض کو سمجھ جائے اور اپنیر عمل کرسکے تو اسکو کسی غیر بادشاہ کے محکوم ومطیع ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر وہ اپنی استادی کی قابلیت سے خود اپنی ہستی کو تعلیم دے تو پھر دنیا میں کسی کا شاگرد بننے کی اسکو ضرورت نہیں ہے۔ اگر اسکو آگاہی ہوجائے کہ دراصل میں خود اپنا پیر ہوں اور مجھ پر اپنے اعضائے جسم۔ اور اعضائے روح یعنی حواس ظاہر و حواس باطن کی ہدایت تلقین دینی واجب ہے اور یہ فرض میں خود ہی سب سے اچھی طرح ادا کرسکتا ہوں تو پھر اسکو کسی غیر پیر کا مرید ہونا ضروری نہیں۔ اگر وہ اپنی اس شان کو سمجھ لے جس سے مغلوب ہوکر وہ دوسرے کا طالب بن جاتا ہے تو وہ سراپا طالب ہوکر اپنی ہستی کو اپنا مطلوب بنائے اور خود طالب اور خود ہی مطلوب بن جائے۔

مگر یہ صفات خدا کی دین ہے کسی کسی کو حاصل ہوتی ہیں۔ ہر انسان ایسا نہیں بن سکتا۔

دنیا میں جس قدر نبی اور پیغمبر ہوئے ہیں وہ اسی قسم کے آدمی تھے جنکو خدا نے ان کی ہستی کا عرفان دیدیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ خدا کی طرف سے خود اپنے بادشاہ۔ خود اپنے استاد۔ خود اپنے پیر اور خود اپنے طالب و مطلوب تھے۔

مگر پیغمبروں میں بھی سب برابر نہ تھے۔ کسی کو اپنے عرفان کی دو چار صفات ملی تھیں کسی کو دس بیس کسی کو سو پچاس کسی کو ہزار دو ہزار۔ اور کوئی تمام صفات کا مالک تھا اور کل صفتوں اور قوتوں کا عارف کامل سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرا کوئی نبی نہ تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلعم پر نبوت ختم ہوگئی۔ اور وحی کے ذریعہ اپنی شناخت اور اپنے فرائض کا عرفان موقوف ہوگیا لیکن خدا تعالیٰ نے امت رسول اللہ صلعم میں یہ لیاقت باقی رکھی کہ وہ نبوت محمدی اور وحی رسالت کے پرتو اور روشنی سے اپنی ہستی و خودی و وجود کا عرفان حاصل کر سکتی ہے۔ اور کرتی ہے۔ بشرطیکہ خدا تعالیٰ اسمیں یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہے اور امت محمدیہ کے افراد بھی اپنے حسن عمل سے اسطرف متوجہ ہوں۔

فلسفہ حیات پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ سب نقلیں اور حکایتیں ہیں۔ کوئی ان کو سمجھتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا۔ مگر اصل فلسفہ زندگانی کی کتاب خود اپنی زندگی ہے۔ اگر اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ جس طرح جاہلوں اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے فلسفہ زیست کی کتابیں الماری میں رکھی رہتی ہیں۔ اور کوئی ان سے فائدہ حاصل نہیں کرتا اسی طرح انسان کی ذاتی زندگی کی کتاب فلسفہ چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ اور آخر ایک دن کرم خوردہ ہو کر نابود ہو جاتی ہے۔

میرا ذاتی علم بہت تھوڑا تھا، میری عقل بھی بہت محدود تھی۔ میرے گرد و پیش اسباب بھی ایسے نہ تھے جو میرے لئے کرایہ کا علم اور کرایہ کی عقل مہیا کرتے جس طرح امیروں کو مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم کرایہ کا علم و عقل مہیا کر دیتی ہے مگر خدا تعالیٰ نے میرے اندر اپنے

سب سے بڑے رسولؐ اور سب سے زیادہ عارف صفات انسانی اور کامل مدارج آدمیت کی روشنی جلوہ گر فرمائی۔ اور مجھکو مشاہدۂ ذات اور معائنہ وجود اور اپنی خودی کے مطالعہ کی طاقت دی۔ جسکو میں نے نور نبوت کی روشنی میں حاصل کیا۔ تو کیا چونکہ میں رسول اکمل حضرت رسول اللہ کی نسل میں ہوں۔ اسواسطے یہ قوت مجھکو عطا ہوئی؟ نہیں کیونکہ لاکھوں آدمی نسل رسولؐ میں موجود ہیں جنکو اس نعمت سے ذرا بھی حصہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ نعمت محض فضل پروردگار سے حاصل ہوئی۔ اور اسی نے نبوت کے آفتاب کی ایک کرن میرے مشاہدات کے آئینہ جسم پر ڈالی جس سے میں نے اپنی ہستی کو بھی پہچانا۔ اور دوسروں کی زندگی کے مشاہدات سے بھی فائدہ حاصل کیا۔

ہندوستان میں ہزاروں آدمی مجھ سے کہیں زیادہ علمیت رکھتے ہیں مجھ سے کئی حصہ سے بڑھکر انشا پرداز ہیں۔ مگر ان کی ضخیم کتابوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور میری لکھی ہوئی چند سطریں ہاتھوں ہاتھ لے لی جاتی ہے۔ آج ہندوستان کے اخبارات اور رسائل میرے ایک مضمون کا معاوضہ (خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو) ایک اشرفی بخوشی دیتے ہیں۔ اور چاروں طرف سے پکارتے ہیں کہ پہلے ہمکو دو۔ پہلے ہمکو دو۔ اور بعض لوگوں کی ایک پوری کتاب بھی ایک اشرفی کو کیا آدھی اشرفی کو بھی کوئی نہیں لیتا۔

آج ہندوستان میں ہزاروں درویش۔ سینکڑوں گدی نشین موجود ہیں اور جو عجائبات خلق کی بے شمار حیثیات ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اور میں ان میں سے ایک حیثیت بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔ نہ ان کی طرح میں رات دن اسی ایک کام میں مصروف رہتا ہوں نہ میری بود و باش ایسی ہے جس سے لوگ میرے مرید ہوں مگر سارے ہندوستان میں کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں خود بخود لوگ میرے مرید نہ ہوئے ہوں۔ (میں گدی تکیہ لگا کر نہیں بیٹھتا۔ مریدوں کا حلقہ ساتھ لے کر نہیں چلتا۔ اور کوئی شان ایسی نہیں رکھتا جس سے بڑا پیر معلوم ہوں) ہر پیر کے مرید ایک علاقہ میں محدود ہوتے ہیں۔ میرے مرید

کل ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی مقام ان سے خالی نہیں ہے۔

ہندوستان میں بے شمار آدمی سیاست و پالٹکس کے ماہر ہیں۔ اور ملک کی سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مجکو نہ سیاسیات کی سمجھ ہے۔ نہ میں نے آجتک ملک کا کوئی بڑا کام کیا ہے۔ مگر ملک کے ہندو مسلمانوں میں سیاسی طور پر بھی ایک حیثیت میری مانی جاتی ہے۔

یہ سب امور محض فضل خدا سے مجکو نصیب ہوئے ہیں۔ اور اسی فضل کی شان ظاہر کرنے کو میں نے یہ حالات بیان کئے ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں نعمت رب کے اظہار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرو) لہذا ہر انسان کو چاہئیے کہ جب اسکو اس قسم کی کوئی نعمت حاصل ہو تو اسپر غور کرے۔ اور خدا کے فضل کا اظہار و شکر بجالائے۔

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے مشاہدات و تجربات لکھتا ہوں۔ تمہید کی ضرورت کو ہر شخص نے سمجھ لیا ہوگا۔ کہ میں اس سے یہ غرض رکھتا ہوں کہ ان مشاہدات کو بینی عنایت والقا کے ماتحت تصور کیا جائے۔ نیز ہر انسان اپنی زندگی اور اپنی ہستی پر غور کرنے اور اسکو سمجھنے کی کوشش کرے۔ کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه (جسنے اپنی ہستی کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا)

پہلا مشاہدہ۔ خدا کا اقرار

مجھ پر ایسا زمانہ گزرا ہے یا ایسے لوگوں کی صحبت سے میں گزرا ہوں جبکہ میں خدا کا انکار کرتا تھا مجکو مذہب ایک اخلاقی بندوبست اور سوسائٹی (جماعت) کا عقلی بندوبست معلوم ہوتا تھا مگر مسلمانوں میں خصوصًا مذہبی پیشواؤں کے گھرانہ میں پیدا ہونے کے سبب کھلم کھلا انکار خدا کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اور دل ہی دل میں مذہب کی عظمت اصلی کو انسان کی آزادی و حریت کا دشمن تصور کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مذہب کو صرف اصلاح اخلاق کی حد تک دخل

غلبہ ہونا جائز ہے۔ اس کے بعد مذہب کا جبر ظلم ہے۔ اگر وہ انسان کو اپنا غلام بنانا چاہتے خدا کی نسبت میں سمجھتا تھا اگر وہ ہے چشم ما روشن دل ما شاد۔ اور اگر نہیں ہے تب بھی کچھ حرج نہیں کیونکہ آدمی میں اتنی عقل و قوت موجود ہے کہ وہ خدا کے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتا ہے۔

مگر جس دن میں نے حضرت علیؓ کا یہ قول پڑھا کہ عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) تو میرے دلمیں ایک پھانس چبھ گئی اور مجھکو تلاش خدا کا ایک فکر پیدا ہو گیا۔ اور جب کبھی میری عقل و محنت و تدبیر نے ایک ایسا کام تیار کیا جسکی تکمیل میں کوئی ظاہری رکاوٹ نظر نہ آئی۔ اور مجھکو دعویٰ ہو گیا کہ کام ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ لیکن وہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ اور اس کام کی تکمیل ناگہانی اور سمجھ میں نہ آسکنے والی افتاد سے پورے ہوتے ہوتے ناقص رہ گئی تو حضرت علی کے قول کی پھانس کھٹکی۔ اور مجھکو خدا کا خیال آنے لگا کہ اسی کی طاقت نے اس کام کو پورا نہ ہونے دیا۔

رفتہ رفتہ میرے مشاہدہ کو معلوم ہو گیا کہ انسان کے ہر عمل میں خدا پوشیدہ ہے۔ اور اسکی عقل و تدبیر ایک ذریعہ اور بہانہ ہے۔ ورنہ بغیر خدا کے کوئی کام بھی پورا نہیں ہو سکتا۔

شروع شروع میں مجھ پر خدا کے دخل در معقولات کا اپنے پے در پے ناکامیوں اور تکلیفوں سے یہ اثر ہو گیا کہ یا تو بالکل منکر خدا تھا۔ اور یا اپنے آپ کو مجبور محض سمجھنے لگا۔ اور یہ خیال ہو گیا کہ انسان کی تدبیر کوئی شئے نہیں ہے۔ جو کچھ ہے خدا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مشاہدات نے اسکو بھی غلط ثابت کیا۔ اور ایک درمیانی حد قائم ہو گئی کہ انسان کا کام تدبیر ہے۔ اور یہ کہ خدا کے فضل پر اس تدبیر کی تکمیل منحصر ہے۔ نہ بغیر عمل و تدبیر کے خدا کی تائید ہوتی ہے اور نہ بغیر فضل خدا کے کوئی تدبیر کامیاب ہو سکتی ہے۔

رسول خدا سے محبت

دیکھا دیکھی کی محبت۔ اور سنی سنائی تعریفوں کی وجہ سے میرے دلمیں رسول خدا صلعم کی محبت جگہ پیدا ہو گئی

تھی۔ مگر اصلی محبت اس مشاہدہ نے پیدا کی۔ کہ دنیا میں جس شخص نے عروج کی اور اقتدار خاص کی قدرت و قوت حاصل کی تو اسمیں کچھ نہ کچھ گھمنڈ اور غرور پیدا ہو گیا اور وہ ماتحتوں سے اپنے آپ کو بلند و اعلیٰ سمجھنے لگا۔ چنانچہ تاریخوں کے مطالعہ میں اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر میں نے ہر فاتح بادشاہ اور ہر نامور حکیم و فلاسفر کے حالات کو اس خرابی سے آلودہ پایا کہ وہ عروج کے بعد بدل گیا اور خودی کی ایک جھلک اسمیں پیدا ہو گئی۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ کی ساری زندگی بالکل یکساں پائی۔ جیسے وہ دور عسرت اور ناکامی و پریشانی کے زمانہ میں تھے۔ ویسے ہی فتح مکہ کے بعد جبکہ عرب کا ہر قبیلہ فوج در فوج آکر مسلمان ہوتا تھا اور سوائے اطاعت شعاروں کے ایک مخالف کی بھی صورت نظر نہ آتی تھی آنحضرتؐ کا طرز عمل ویسا ہی غریبانہ اور مساویانہ رہا۔ جیسا کہ شروع میں تھا۔ اور ان کے عمل میں ایک بات بھی ایسی نہ پائی گئی۔ جس سے کچھ بھی غرور و خود پسندی کی بو آتی۔

اس مشاہدہ نے میری محبت کو دیوانوں کی طرح آنحضرتؐ سے وابستہ کر دیا۔ اور میں نے طے کر لیا کہ اگر خدا مجھکو بھی کامیاب اور اقتدار کی زندگی عطا فرمائے گا تو میں رسولؐ خدا کی اس سنت پر عمل کرونگا اور غرور و تمکنت کو پاس نہ آنے دونگا۔

آج جو کچھ تبدیلی میری مفلسی و پریشانی میں اچھے اور آسایش کے وقت نے پیدا کی ہے اسمیں مجکو نظر آتا ہے یا میں خود اسوۂ حسنہ رسولؐ خدا کا خیال کرنے سے نفس کو دبا کر دیکھتا ہوں کہ کچھ بھی گھمنڈ اور تمکنت اس حالت سے مجھ میں نہیں ہے۔ اور میں اسی غریبانہ مزاج اور مفلسانہ عادت سے زندگی بسر کرتا ہوں جیسے پہلے کرتا تھا۔ بوجھ کندھے پر رکھ کر دہلی شہر کے بازاروں میں پھرتا ہوں اور پوزیشن کا ذرا سا خیال بھی میرے دل میں نہیں آتا سواری نہ ملے تو پیدل چلنے میں مجکو اپنی بے وقعتی کا خوف نہیں ہوتا۔ موٹر میں بیٹھوں تو غرور نہیں کرتا۔ اور دوسرے دن ایک ذلیل ٹوٹے پھوٹے یکہ میں بیٹھنا پڑے تو یہ نہیں سوچتا کہ کل تو موٹر میں بیٹھا تھا۔ آج یکہ میں کیونکر بیٹھوں کیونکہ میں

منزل پر پہنچنے کا خیال ضروری سمجھتا ہوں اور اس کو نہیں دیکھنا چاہتا کہ کس ذریعہ سے منزل پر پہنچا۔

اسوۂ حسنہ رسول خدا کے مشاہدہ نے زندگی کی راحت کا یہ مشاہدہ مجکو دیا کہ جو شخص خوشی میں نہ اترائے اور غم میں نہ گھبرائے اسکی زندگی اس دنیا میں بہشت کی زندگی ہے۔ اور یہ اختیار نفس پر کہ خوشی و غم کا غلام نہ بنے جب ہی ہوتا ہے کہ کسی اپنے سے بڑے شخص کی زندگی کا دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ اور اپنی زندگی سے مطابق کرکے دیکھتا رہے۔

بزرگوں سے عقیدت

پیروں بزرگوں سے عقیدت کے مسئلہ کو میں نے جس قدر سوچا اسی قدر موجودہ پیروں اور بزرگوں سے بیزار اور الگ ہوتا گیا۔ کیونکہ جو واقفیت میں نے سیاحت اسلامی دنیا اور سیر ہندوستان میں گدی والے اور نامور بزرگوں کے اندرونی حالات سے حاصل کی تھی وہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ میں نے اکثر بزرگوں کو دنیا دار اور دنیاوی توڑ جوڑ میں مبتلا دیکھا تھا۔ اور دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ نہ پیروں اور ظاہری دکھاوے اور مریدوں کے مشہور کرنے سے یہ لوگ بڑے بنتے ہیں ورنہ درحقیقت یہ کسی عقیدت کے مستحق نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تو دنیا داروں سے بڑھ کر دنیا میں ملوث ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا بڑھا کہ متقدمین (گذشتہ زمانہ کے بزرگوں) کی نسبت بھی شک ہونے لگا کہ ان کو بھی کتابیں لکھنے والوں نے مشہور بنا دیا ہے ورنہ یہ بھی ایسے ہی ہوں گے جیسے یہ ان کے پیرو اور مقلد ہیں۔

اسی زمانہ میں حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر دیکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ تو چراغ کو دیکھ اور اسکی روشنی میں راستہ چل۔ چراغ دکھانے والے کو نہ دیکھ کہ وہ اچھا ہے یا برا ہے اگر اسکو دیکھے گا تو راستہ نہ چل سکیگا۔ کیونکہ روشنی آگے پڑتی ہے چراغ کے پاس تاریکی رہتی ہے۔

اس شعر نے میرے مشاہدے کے رخ کو بدل دیا۔ اور میں نے بزرگوں کی عقیدت کو

ذاتیات سے ہٹا کر اس ارشاد پر متوجہ کر لیا جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور جو ان کے ظاہری اعمال سے صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی ارشاد کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی شیرازہ بندی اور اصلاح ہوتی ہے۔ اور وہ ارشاد ہی عقیدت و اطاعت کا مستحق ہے۔

مشاہدہ کا رخ بدلتے ہی مجھکو ان بزرگوں کے کمالات و محاسن زیادہ نظر آنے لگے۔ اور ان کے عیب کا اثر دل سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب میرا مشاہدہ دلی صداقت سے ان بزرگوں کا ادب کرتا ہے۔ اور ان کی دنیاوی کمزوریوں کو لازمۂ بشریت سمجھتا ہے جس سے کوئی آدمی جب تک کہ وہ آدمی ہے پاک ہونے کا دعوے نہیں کر سکتا۔

آخر مشاہدہ کی اس تبدیلی سے میں نے یہ بات اصولی زندگی کی شان میں کہدی کسی کے عیب و ہنر کو دیکھو تو اپنے عیب و ہنر کی عینک لگا لو۔

اعتدال کا مشاہدہ

میں نے اپنی ہر ناکامی اور کامیابی کی وجہ پر غور کرنی شروع کی تو مشاہدہ نے مدت کے بعد بتایا کہ اعتدال میں کامیابی ہے اور بے اعتدالی میں ناکامی جس کام کو میں نے اعتدال سے شروع کیا۔ اور اعتدال سے چلایا۔ اور آخر تک اعتدال کو پیش نظر رکھا اسکو میں نے حاصل کر لیا اور کچھ دشواری اس کے حصول میں نہ ہوئی اور جس کام کو جلد بازی اور بے اعتدالی کے دلدل میں ڈالا شکست کھائی اور ناکام رہ گیا۔ اعتدال دین کے کاموں میں اور دنیا کے مقاصد میں یکساں ضروری ہے۔ آجکل پولٹیکل خیالات میں نرم و گرم فرقوں کو معتدل و غیر معتدل کے نام سے پکارا جاتا ہے اور میں معتدل (ماڈریٹ فرقہ) کو اچھا نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میرے ذہن میں اعتدال کی جو تعریف ہے۔ اس سے معتدل گروہ محروم ہے۔ اور غیر معتدل (ایکسٹریمسٹ) جماعت بھی اپنی گرمی میں اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھتی لہذا وہ بھی میری رائے میں ناکام رہے گی۔

عمل میں نام کا اعتدال نہیں بلکہ حقیقت کا اعتدال ہونا چاہیئے۔ سیاسی جماعتیں معتدل ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں وہ بے اعتدالی سے خوشامد اور چاپلوسی کی طرف جھک جاتی ہیں اور یہ شان اعتدال کے خلاف ہے۔ معتدل وہ ہے جو نہ ادہر جھکتا ہے نہ ادھر۔ بلکہ وسط میں قائم رہتا ہے۔

ہندوستان کی پالٹیکس میں میرے زیر بحث مقصد کی مثال جس سے اعلیٰ اعتدال کی صورت معلوم ہوسکے یہ ہے کہ حق اور مقصود سے جوش اعتدال میں جدا نہ ہو۔ فرق اعتدال و غیر اعتدال کا اس حق و مقصد کی طلب میں ہونا چاہیئے کہ جو فریق گرم ہے وہ گستاخانہ اور احمقانہ جلد بازی کے طریقوں سے حق طلب کرتا ہے معتدل فریق شائستگی اور وقار۔ اور حفظ مراتب کی شان سے حق طلب کرے۔ یہ نہ ہو کہ جوش اعتدال میں حق و مقصد ہی کے خلاف ہوجائے۔ جیسا کہ آج کل ماڈریٹ پارٹی کے لیڈر نا دانستگی سے کر بیٹھے ہیں کہ ان کی روش ہندوستان کے حق اور مقصد کے سراسر خلاف نظر آتی ہے۔ اس سے اعتدال ہی کا چہرہ مسخ نہیں ہوتا بلکہ گرم پارٹی کے طیش اور مجنونانہ حرکات کو بھی تقویت ہوتی ہے اور وہ ان گمراہ اعتدال پسندوں کی ضد سے از حد خلاف اعتدال چلنے لگتی ہے اور اس گناہ کا عذاب اعتدال پسندوں کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے جو باعث اس خطا کے ہوئے۔

کھانے میں اعتدال۔ پینے میں اعتدال۔ پہننے میں اعتدال۔ رہنے سہنے میں اعتدال کمانے میں اعتدال۔ خرچ کرنے میں اعتدال۔ دوستی میں اعتدال۔ دشمنی میں اعتدال۔ یہاں تک کہ عبادت خدا میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے جو لوگ بے اعتدالی سے ہر وقت نماز۔ روزے۔ وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ اور فرائض زیست اور حقوق دنیا کو پس پشت ڈالدیتے ہیں وہ غیر معتدل ہیں۔ اور خدا کی لعنت اس عبادت کے عوض انکے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے۔

جو کھانے میں اعتدال نہ کریگا۔ تو زیادہ کھانے سے ہیضہ ہوجائے گا یا کم کھانے سے

بدن میں کمزوری پیدا ہوگی۔ جو حد سے زیادہ پانی پیئے گا بیمار ہو جائے گا اور کم پینے سے بھی علالت پیدا ہوگی۔ جو موسم کے خلاف اور غیر معتدل کپڑے پہنے گا اسکو تن پوشی کام نہ دے گی اور نقصان اٹھائے گا جس کا مکان اور رہنے کی جگہ غیر معتدل ہوگی وہ کبھی بود و باش کا آرام نہ اٹھا سکے گا۔ کمانے اور محنت کرنے میں جو اعتدال سے آگے بڑھے گا چار دن میں تھک کر بیٹھ جائے گا۔ اور جو اعتدال سے کمائے گا برسوں سلامت رہے گا اور خرچ کے اعتدال کی نسبت تو قرآن شریف نے فرمادیا ہے کہ کھاؤ۔ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔ کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ فضول خرچی سے مراد بے اعتدال خرچ کرنا ہے۔ اور مثل ہے جتنا چادر دیکھو اتنے ہی پاؤں پھیلاؤ۔ یعنی جس قدر خرچ کرنے کو ہو اسی اعتدال سے خرچ کرو۔ گنجایش سے آگے نہ بڑھو۔

دوستی کا اعتدال اور دشمنی کا اعتدال تو ایسی چیزیں ہیں جنکو میں ایک بڑی کتاب میں کھول کھول کر لکھوں تب بھی ضرورت پوری نہ ہو کیونکہ دنیا میں بڑی خرابی اسی بے اعتدالی سے پڑی ہوئی ہے اور لوگوں کو دوستی کے اعتدال اور دشمنی کے اعتدال کا وزن سمجھنے میں بہت دشواری پیش آتی ہے۔

آج دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اسی دولت اعتدال سے محروم ہیں۔ انگلستان کے مدبروں نے جنگ یورپ میں دوستی اور دشمنی کے اعتدال کو ملحوظ نہ رکھکر بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔ انھوں نے اپنے پرانے دشمن روس کو عارضی دوستی کے ایام میں اتنا زیادہ دوست بنا لیا کہ دولت۔ ہتیار۔ اور پوشیدہ راز تک اسکو جلدی سے دیدیئے سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت اور ہتیار اور راز روس نے انگلستان ہی کے خلاف استعمال کیے اگر وہ دوستی میں اعتدال ملحوظ رکھتا اور حد سے زیادہ اس نئے دوست پر بھروسہ نہ کر لیتا تو اسکو یہ شرمندگی جو عقلا میں اٹھانی پڑی اور یہ مادی نقصانات جو اسکو سلانے پیش آئے کبھی برداشت نہ کرنے پڑتے۔

یہی حال دشمنی کے اعتدال کا ہے مگر میں اسکی مثال جنگ یورپ اور انگلستان کے نام سے نہیں دینا چاہتا۔ البتہ اتنا لکھنا چاہتا ہوں کہ جنکو دشمن سمجھا جائے۔ یا جنکی دشمنی سے سابقہ پڑے تو ایسی روش قایم کرنی چاہئیے کہ جب وہ دشمن دوست ہو جائے تو اس سے ندامت نہ اٹھانی پڑے۔

بزرگوں نے کہا ہے کہ دوست سے اپنے سب راز نہ کہو۔ شاید وہ کبھی تمہارا دشمن ہو جائے اور دشمن پر سب جوش ختم نہ کرو۔ شاید کبھی اسکو تمہاری دوستی کا موقع ملے تو تمہارے جوہر تم ہی کو سنائیں گے۔

میرا نقص

دوستی کے مسئلہ میں مجکو اپنا نقص ہزاروں مشاہدوں نے بتایا کہ میں جلدی سے دوسروں کا دوست بن جاتا ہوں۔ یا دوسروں کو اپنا دوست سمجھنے لگتا ہوں۔ دوستی بہت مشکل چیز ہے۔ اور اسمیں بڑی احتیاط اور پورے اعتدال سے کام نہ لیا جائے تو انسان کو نہایت سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اب میں بہت جلدی کسی کو دوست نہیں بناتا۔ نہ خود کسی کا دوست بنتا ہوں۔ اور دوست بنانے میں مجکو مشاہدہ اور تجربہ سے مسلسل کام لینا پڑتا ہے۔ ملنساری کا برتاؤ اور چیز ہے اور دوستی کسی دوسری شئے کو کہتے ہیں۔ دوستی ایک نا قابل ختم ملنساری ہے اور جیسی زندگی کو اسکی سخت ضرورت ہے ویسی ہی مشکل سے وہ میسر آتی ہے۔

جس زمانہ میں خفیہ پلس کی نگرانی مجھ پر تھی۔ عجیب و غریب دوستوں سے سابقہ پیش آیا اور ان دوستوں نے چند روپے کی تنخواہ کے عوض مجکو آزار پہنچائے۔ مگر اب میرے مشاہدہ میں اتنی قوت ہے کہ بناوٹی دوستوں کو آسانی سے پرکھ سکتا ہوں۔

ایکا ایکی محبت میں ٹوٹ پڑنے والا آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیوں اور کس غرض سے محبت جتاتا ہے۔ جو شخص اسپر غور کرے گا۔ اور اعتدال سے نہ ہٹے گا۔ تو محبت جتانے والے کے ضرر سے کوئی تکلیف اسکو نہ ہوگی۔

مشہور آدمی۔ یا پیر کی شخصیت جسکی ہوا اسکو فوری محبت کے سمجھنے میں بہت مشکل ہوتی ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے واقعی محب بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ اسکو تجربہ اور مشاہدہ کی قوت درکار ہے جس سے وہ کھرے کھوٹے کو پرکھ سکے ۔

زیادہ خط و کتابت

مجکو بچپن اور شروع زندگی میں لوگوں سے خط و کتابت کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور خواہ مخواہ کے دوست اس مقصد تکمیل کے لیئے پیدا کرتا تھا۔ اب یا تو کام کی کثرت یا قوت مشاہدہ و تجربہ کے بڑھ جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی غلطی تھی۔

صوفیوں نے کہا ہے تعلقات کا کم کرنا تصوف ہے۔ میں کہتا تھا تعلقات ہی کا نام زندگی ہے۔ اب کہتا ہوں صوفی سچے ہیں۔ تعلقات کی کمی تصوف ہی نہیں بلکہ بڑی آسائش کی زندگی ہے۔ جس کے تعلقات کم ہیں اسکی تکلیفیں اور ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

زیادہ میل جول والا دنیا کے مقاصد کو جلدی حاصل کر لیتا ہے۔ اور تعلقات ایک ایسی طاقت رکھتے ہیں جو نہ حکومت میں ہے نہ دولت میں ہے۔ اگر ان تعلقات کے برقرار رکھنے میں جو روح کا جوہر اور بے تعلق زندگی کی راحت خرچ کرنی پڑتی ہے اس سے آدمی بالکل ادھ موا ہو جاتا ہے۔ اور وزن کرنے سے تعلقات کی طاقت بے تعلقی کی راحت سے بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے۔

اس لیئے میں نے کہا ہے۔ مردہ اچھا زندہ ہے کہ تعلقات نہیں رکھتا۔ اور زندہ مردہ ہے کہ تعلقات کی سکرات میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے۔

اپنا کام اپنے ہاتھ سے

مشرق کی غلامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مشرق سلاطین و امرا اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے۔ اور دوسروں پر ہر چیز کا حصر رکھتے ہیں۔ میں نے ابتدا سے آنحضرت صلعم کی سنت کا خیال کر کے اپنے ہر کام کو اپنے ہی ہاتھ سے کیا۔ کیونکہ آنحضرت صلعم اپنے سب کام خود اپنے دست

مبارک سے کرتے تھے۔ اور باوجود غلاموں اور امت کے بے شمار خدام کے کسی پر اپنا بوجھ نہ ڈالتے تھے۔

ذاتی تجربہ سے مشاہدہ ہوا کہ "آپ کام مہا کام" کی مثل بالکل سچی ہے۔ میری کامیابی کا راز ایک یہ بھی ہے کہ میں اپنے سب کام خود کرتا ہوں۔ اور جب تک دوسروں کے کام پر خود ایک نظر نہ ڈال لوں جو وہ میری ملازمت میں انجام دیتے ہیں مجکو اطمینان نہیں ہوتا۔ میں عام پیروں کی طرح سفر میں مریدوں کو یا بڑے آدمیوں کی طرح نوکروں کو ساتھ نہیں رکھتا۔ اور اگر گھر والے میری علالت یا کسی خطرہ کے خیال سے نوکر کو میرے ساتھ کر دیں تو خود مجکو اس نوکر کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی ذات کی آسایش سے زیادہ اپنے رفیق کا خیال رہتا ہے۔ نوکر صاحب کے پاس جا کر کھانا دیتا ہوں۔ پانی پہنچاتا ہوں۔ انکی اچھی اور آرام کی جگہ کا فکر ہر وقت بے چین رکھتا ہے کیونکہ میں سکنڈ یا فرسٹ کلاس میں ہوتا ہوں اور وہ جناب تھرڈ میں ہوتے ہیں۔ اور تھرڈ کلاس جسم قسم کی دوزخ ہے اسکو سب جانتے ہیں۔

اپنا بچھونا سفر کے زمانہ میں خود بچھانا خود سمیٹنا مجکو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ گھر میں بیوی اور سفر میں بعض احباب و مریدین اصرار کریں تو میں یہ حق انکو دیدیتا ہوں۔ مریدوں سے وضو کرانے کی مجکو بالکل عادت نہیں ہے۔ اور جہاں کہیں ایسا پیش آئے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

پاؤں دبوانے کی عادت البتہ مجکو ہے۔ مگر اب اسکو بھی رفتہ رفتہ ترک کر رہا ہوں۔ دوسروں کا کام کرنے میں جو لذت مجکو آتی ہے وہ دوسروں سے اپنا کام کرانے میں نہیں آتی۔ خدمت کرکے مخدوم بننے کی حرص و ہوس مجکو نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرح کی عادت و خصلت ہو گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ میں ہر وقت مستعد رہتا ہوں اور میرے کاموں میں بہت کم غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔

تجارتی معاملات میں دس دکانوں پر پھیر کر اور چیز کا مقابلہ کرکے اور نرخ کی کمی بیشی سمجھ کر خرید و فروخت کرتا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ واحدی صاحب و دیگر ہم پیشہ تاجروں سے مجھکو نفع زیادہ ہوتا ہے کیونکہ میں کاغذ کی خرید۔ لکھائی۔ چھپائی اور تمام جزئیات کو اپنی ذاتی نگرانی میں کرتا اور کراتا ہوں۔ وہ اسکی کم پروا کرتے ہیں بلکہ نوکروں پر دارومدار رکھتے ہیں
میں جانتا ہوں کہ ایک انسان سب کاموں کو اپنے ہاتھ سے نہیں کرسکتا اور نہ تمام باتوں کی نگرانی ممکن ہوسکتی ہے۔ تاہم اس عادت سے آدمی کاہل اور دوسروں کا محتاج نہیں ہونے پاتا۔ اور ماتحت لوگ غفلت نہیں کرسکتے۔

ایک دفعہ رسالہ نظام المشائخ تیار تھا۔ اور ملازم موجود نہ تھا۔ جو ڈاک خانہ لیجاتا کوئی مزدور بھی نہ ملا۔ ڈاک کا وقت جا رہا تھا۔ میں نے خود وہ بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا اور واحدی صاحب کی مخالفت شدید کے باوجود خود لے جاکر ڈاک خانہ میں پہنچا دیا۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جو دوسروں کو کامی بنانا چاہتا ہے وہ ان کو زبانی نصیحت کچھ نہ کرے بلکہ ان کے سامنے خود کام کرنے لگے وہ سب کامی بن جائیں گے۔ میں نے بڑے بڑے کاہل وجود اور کام کو خلاف فیشن سمجھنے والے لوگوں کو دیکھا ہے کہ مجھکو خود کام کرتے دیکھ کر وہ مجبوراً کام کرنے لگے جس کام کو جلدی پورا کرانا ہو تو میں خود نوکروں کے ساتھ کام کرنے لگتا ہوں۔ اور اپنی عملی تیزی اور پھرتی سے انہیں کام کی جان ڈالدیتا ہوں۔

سوائے شدید بیماریوں کے کوئی دن میری زندگی کا ایسا نہیں گزرا جب میں نے اپنی ذات کی یا دوسرے کسی کی وہ خدمت نہ کی ہو جو امیر اور بڑے لوگ صرف نوکروں سے کرایا کرتے ہیں۔ میں اپنی بیوی اور لڑکی کو تربیت کرنے کے لیے بعض اوقات گھر میں جھاڑو بھی دیدیتا ہوں۔ برتن بھی مانجھ لیتا ہوں۔ پانی کے مٹکے بھی صاف کرلیتا ہوں بلکہ صبح کے وقت عموماً تھوڑا وقت ان کو گھر کی صفائی اور چیزوں کے سلیقہ سے رکھنے میں مشغول رکھ دیتا ہوں۔ اس طرح کہ دوڑ دوڑ کر خود دو چار کام کئے اور ان کی مشین چلا دی۔ اسکے بعد وہ

سب خود مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور میں اپنا دوسرا کام لکھنے کا شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے نکمے آدمیوں سے سخت نفرت ہی نہیں عداوت ہے کیونکہ میں ان کو خدا کی زمین کا ایک بوجھ سمجھتا ہوں۔ میرا بس چلے تو ان کو قتل کر ڈالوں۔ جو پڑے رہتے ہیں اور وقت بے کار کھوتے ہیں اور اپنا کام دوسروں سے کراتے ہیں۔

صفائی کی ناقابلیت

مجھ میں صاف رہنے۔ اور لکھنے پڑھنے کی جگہ کو صاف رکھنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔ حالانکہ میں بہت زیادہ اسکی کوشش کرتا ہوں۔ اس معاملہ میں واحدی صاحب کی صفائی ستھرائی پر مجھے رشک آتا ہے۔

میں نے اسکو بہت سوچا کہ باوجود خود کام کرنے اور ہر کام کا خیال رکھنے کے میری اس کمزوری کی درستی کیوں نہیں ہوتی۔ تو تجربہ نے مجکو بتایا کہ ابتدائی تخم ریزی کا قصور ہے۔ اگر بچپن سے مجکو چیزوں کے رکھنے اور مرتب کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا تو اب مجکو کچھ بھی محنت نہ کرنی پڑتی اور میں ایک عادت کی طرح اپنی چیزوں کو مرتب اور صاف رکھ سکتا۔

صفائی اور سلیقہ محنت سے نہیں آتا۔ اس کے لئے شروع سے تربیت ہونی چاہیئے بلکہ میرا تو تجربہ یہ ہے کہ سلیقہ کے لیئے دولت اور علم کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے ہزاروں آدمیوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس کثیر دولت بھی ہے۔ اچھا مکان بھی ہے۔ آرایش کا سامان بھی ہے۔ علم بھی ہے مگر سلیقہ نام کو نہیں۔ آرایش کی پرتکلف چیزیں گھر میں اس طرح بکھری پڑی رہتی ہیں جیسے کوڑا۔

اور بعض غریبوں کو دیکھا کہ نہ عمدہ مکان ہے نہ سامان آرایش ہے نہ وہ تعلیمیافتہ ہیں مگر ان کا غریبانہ گھر ایسا صاف و مرتب نظر آتا ہے کہ اسکو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر میں سلیقہ کی قابلیت نہیں ہوتی۔ اور آخر الذکر میں ابتدا سے سلیقہ ہوتا ہے۔ تربیت کے ساتھ اگر کنکروں کو اور پتھروں کو رکھدیا جائے تو وہ

بھی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور موتی اور ہیرے بے ترتیبہ بکھیر دیئے جائیں تو جی چاہتا ہے کہ ان کو جھاڑ دے سے صاف کرکے پھینک دیا جائے۔

اِس معاملہ میں نئی روشنی والوں کی تمیز داری مجکو بہت پسند ہی کہ انکی ہر چیز صاف ستھری اور سلیقہ مند ہوتی ہی۔ میرا دل اندر سے صفائی اور سلیقہ کو ڈھونڈتا ہی میری آنکھیں تلاش کرتی ہیں کہ میں جہاں بیٹھا ہوں وہ ہر اعتبار سے مرتب اور صاف ہو مگر وہ صفائی اور ترتیب سامنے نہیں آتی۔ کیونکہ اسکی طاقت میرے اندر بند ہو گئی ہے اور ابتدائی نقص نے اسکو باہر آنے سے روک دیا ہی۔ اور اسکے آنے کے دروازہ پر قفل لگ گیا ہے۔

میری بیوی ان سب عورتوں سے زیادہ تمیز دار اور باسلیقہ ہیں جن میں وہ پیدا ہوئیں۔ اور ہوش سنبھالا۔ مگر میری اندر کی تڑپتی ہوئی اور بند خواہش صفائی و سلیقگی کو وہ بھی باہر نہیں لاسکیں کیونکہ ان کی بھی ابتدائی تربیت ویسی ہی ہوئی ہے۔ جیسی میری ہوئی ہے۔

مجھسے کہا جاتا ہے شاعر اور مضمون نگار اور خدا رسیدہ لوگ ان ظاہری تکلفات کی طرف توجہ نہیں کیا کرتے۔ اور ان سب کی حالت ایسی ہوتی ہے۔ مگر میرے دل میں اس بیان کو قبول کرنے کی گنجایش نہیں ہے کیونکہ اندر والی چیز اسکے خلاف دکھا دینے کا دعوی کرتی ہے اگر اسکو موقع ملے۔

اس مشاہدہ زندگی سے افسردہ ہو کر میں کہتا ہوں۔ دنیا میں کوئی شخص دولت اور اسباب دنیا کی ترقی نہ چاہے بلکہ یہ دعا مانگے کہ الٰہی مجکو سلیقہ دے۔ کہ میں تیری تھوڑی سی نعمت کو بھی بہت سا کرکے دکھا دوں۔

اس تجربہ سے لوگوں کو راغب ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کو یورپین معلموں سے یا یورپین طرز کے جاننے والوں سے گھر داری کا سلیقہ تعلیم کرائیں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ ان کو یورپین بنا دو یا ان کی طرح نمایش و آرایش میں فضول خرچی کرو۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے

کہ ان کو اپنے جسم۔ اپنے لباس۔ اور اپنے گھر کے سامان کا سلیقہ سے رکھنا اور صفائی سے برتنا سکھاؤ۔ کہ اسمیں زندگی کی اصلی راحت ہے۔

مجھے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بے سلیقہ گھروں میں آرایش کا سامان لانا بڑی غلطی ہے۔ جب تک ان چیزوں کا گھر والوں کو برتنا نہ آتا ہو تو ان کو وہ چیزیں دینی اپنے روپے کا برباد کرنا ہے۔ اور دل کا خواہ مخواہ جلانا ہے۔

تجربہ نے سکھایا کہ اگر ہر چیز کا مرتب رکھنا منظور ہو تو جہاں سے کوئی چیز اٹھاؤ وہیں اسکو رکھ دو۔ اور یہ خیال نہ کرو کہ پھر فرصت میں رکھ دیں گے۔ کیونکہ آئندہ کا خیال ہی انسان کے ضابطہ میں خلل ڈالتا ہے۔ جو کام کرنا ہو اسکو فوراً کرو۔ دوسرے وقت پر منحصر کرنا غلطی ہے۔ بائسکوپ کے تماشہ نے مجکو سکھایا کہ یورپ والے جب گھر میں آتے ہیں تو دروازہ بند کرکے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو ایک منٹ میں چار دفعہ کمرہ کے اندر باہر جانا آنا پڑے تو ہر دفعہ دروازہ بند کریں گے اور کھولیں گے یہ نہیں ہوگا کہ ابھی واپس آنا ہے لاؤ دروازہ کھلا چھوڑ چلیں کیونکہ ابھی پھر کھولنا پڑیگا۔ وہ اسکی پروا نہیں کرتے اور ہر نقل و حرکت میں دروازہ ضرور بند کرتے ہیں۔ یہاں تک دیکھا کہ چور کسی گھر میں چوری کرنے آتا ہے تو وہ بھی کمرہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ کیونکہ ان کو دروازہ کھلا رکھنے کا علم نہیں ہے اور وہ اسکا بند کرنا ہی جانتے ہیں۔ اور ہم لوگوں میں یہ عادت ہے کہ ضروری اور قیمتی اسباب کی کوٹھڑیاں اور الماریاں تک کھلی پڑی رہتی ہیں۔

ایکدفعہ جنگل میں کتے رو رہے تھے۔ ایک بوڑھے کتے نے پوچھا تم کیوں روتے ہو انھوں نے کہا بڈھی عورت نے اپنے دروازہ میں کواڑ چڑھوا لئے۔ اب ہم اسکے گھر میں کھانے پینے کو کیونکر جائینگے کواڑ نہ تھے تو بڈھی عورت کے گھر سے ہمارا پیٹ پلتا تھا بوڑھے کتے نے کہا۔ ارے دیوانو۔ جب وہ عورت بوڑھی ہے اور تمہارا انتظار کرنے کی اسکو لیاقت نہیں تو کواڑ بند کون کریگا۔ کواڑ بن گئے ہیں تو بن جانے دو۔ وہ ہمیشہ کھلے پڑے رہینگے

کہ سگھڑ عورت بغیر کواڑوں کے بھی گھر کو کتوں سے بچا سکتی ہے۔ اور پھوہڑ عورت مضبوط قلعہ میں بھی کتوں کو آنے سے نہیں روک سکتی ؀

نکمے اور کاہل نوکر

میرے ہاں بعض کاہل اور نکمے نوکروں کو دیکھ کر دوستوں نے اعتراض کیا کہ تم ایسے فضول آدمیوں کو کیوں نوکر رکھتے ہو۔ جو کام نہیں کرتے یا کام کرنے سے دم چراتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ایک کامی اور لائق آدمی کے نوکر رکھنے سے بیشک کام اچھا ہوتا ہے مگر نکموں کی اصلاح کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ کام چور لوگ مجھکو کام کرتا دیکھ کر شاید کام کرنے لگیں۔ اور ان کی اصلاح ہو جائے تو میں ایک مردہ کو زندہ کرنے کا ثواب کماؤں گا۔

تجربہ کار دوستوں نے ایک جرمن کا واقعہ بیان کیا کہ وہ ہندوستان کے ہر طالب علم سے دریافت کرتا تھا کہ اگر ایک اشرفی دریا میں ڈوب جائے۔ اور اس کے نکالنے میں دو اشرفیاں خرچ ہوں۔ تو تم اسکو نکالو گے یا نہیں تو ہر ہندوستانی جواب دیتا تھا کہ ہم ایسی بیوقوفی کبھی نہ کرینگے کہ ایک اشرفی کے لیئے دو اشرفیاں خرچ کریں۔ اور ایک کو زندہ کرنے میں دو کو مار ڈالیں۔ مگر وہ جرمن جب یہی سوال اہل جرمن سے کرتا تو وہ جواب دیتے کہ دو اشرفیاں چھوڑ ہم دو سو اشرفیاں ایک اشرفی کو دریا سے نکالنے میں خرچ کر دیں گے کیونکہ وہ دو سو اشرفیاں مردہ نہیں ہونگی بلکہ ہمارے ملک والوں کے پاس چلی جائینگی جو اشرفی کو دریا سے نکالنے کی محنت کرینگے۔ اس طرح دو سو اشرفیوں کی زندگی بھی قائم رہے گی۔ اور وہ مردہ اشرفی بھی زندہ ہو جائے گی۔

پس اس سماعی واقعہ سے مجکو عبرت ہوتی ہے اور میں اپنے مردہ بھائیوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے وہ میرا کام خراب کر دیں۔ یا اجرت کی موافق محنت نہ کریں مگر ایک مشغلہ میں تو لگے رہیں گے۔ اگر میں نے ان کو جواب دیدیا تو کوئی انکی کام چوری اور نکمے پن کے سبب ان کو نوکر نہ رکھے گا اور یہ رہے سہے بھی ناکارہ ہو جائینگے چکموں کے کھانے

وہ بالکل کچھ نہ کرنے کے مقابلہ میں کچھ تھوڑا کر لینا بھی غنیمت ہے۔"

ہنسی خوشی کا ایک منٹ بھی قیمتی ہے

سنہ ۱۹۱۱ء میں پورٹ سعید سے بمبئی آ رہا تھا۔ راستہ میں طوفان آیا۔ اور افسران جہاز نے خطرہ کا اعلان کیا۔ اور جان بچانے کی تدبیریں بتانی شروع کیں۔ میرے قریب چند یہودی عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر رونے پیٹنے لگیں۔ مجھے ہنسی آگئی کیونکہ ان کا رونا کچھ اسی قسم کا تھا۔ ایک عورت نے مجھ کو ہنستا دیکھ کر کہا کیا تم کو اپنے مرنے کی خبر نہیں ہے جو ہنستے ہو۔ میں نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ جہاز خطرہ میں ہے۔ مگر میں ہنس کر مرنا چاہتا ہوں اور تم رو کر مرنا چاہتی ہو۔ مرنا دونوں کو پڑے گا۔

اس بے خوفی کا سبق مجھ کو دمشق میں ملا تھا۔ میں نے ایک بدو سردار کو ترکی پولیس کے ہاتھوں میں مقید دیکھا۔ وہ سردار بہت بشاش اور بے فکر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پولیس سے پوچھا یہ کون ہے اور اس کا کیا جرم ہے۔ اس نے کہا یہ مشہور ڈاکو ہے اس نے ریل کی پٹریاں اکھاڑی تھیں۔ اور ڈاکے بھی بہت مار چکا ہے۔ اب اس کو قتل کیا جائے گا۔ اب تو مجھے اور بھی تعجب ہوا کہ مرنے کو جاتا ہے اور خوش ہے۔ آخر پولیس کی اجازت سے میں نے بدو سے پوچھا کہ تم خوش معلوم ہوتے ہو شاید تم کو اپنے پھانسی پانے کی خبر نہیں ہے بدو نے ہنس کر جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ کل دوپہر کو اس سامنے والے پل پر موت کی رسی میں لٹکایا جاؤں گا۔ مگر میں نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ خوشی کی ایک ساعت ہزار سولو سے خریدی جائے تب بھی سستی ہے۔ پھر میں کئی ساعت کی خوشی کو ایک موت کے ہاتھ کیوں فروخت کر دوں۔"

صحبت اچھی یا وقت

میری عادت مریدوں اور دوستوں سے ظرافت اور خوش طبعی کرنے کی بہت ہے۔ کسی پیر کو میں نے مریدوں سے اتنا بے تکلف نہیں دیکھا تھا جتنا میں اپنے مریدوں کے ساتھ ہوں۔ مرید ہی نہیں

میں اپنے گھر والوں سے بھی ہر وقت ہنسی خوشی کی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ اور یہ میری عادت ہوگئی ہے۔ جسکو اگر بدلنا چاہوں تو بدل نہیں سکتا۔

تجربہ نے مجھکو بتایا کہ یہ عادت محبت بڑھاتی ہے۔ اور وقعت گھٹاتی ہے۔ جو تعلق میرے مریدوں کو مجھ سے ہے وہ بہت کم پیروں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہر پیر کو تجربہ پیش آیا ہوگا کہ کچھ مرید اس کے بدعقیدہ و منکر ہوگئے۔ مگر مجھکو ایک مرید بھی ایسا نہیں ملا جس نے مرید ہو کر سرکشی کی ہو۔ یا بیعت سے مرتد ہوگیا ہو۔ اسکی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ میں اپنے مریدوں سے دوستوں اور بہت بے تکلف دوستوں کا برتاؤ کرتا ہوں اور وہ مجھ سے اپنے مخفی مخفی حالات اسطرح کہہ دیتے ہیں جو دوستوں کے سوا کسی سے نہیں کہے جاتے اور انکو مجھ سے پیری کے تعلق کیساتھ دوستانہ محبت بھی ہوجاتی ہے۔

مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ بعض اوقات یہ خوش طبعی میری وقعت کو نقصان پہنچاتی ہے اور ان پر میرا وہ رعب قائم نہیں رہتا۔ جو اطاعت کے فرض پورا کرنے میں ضروری چیز مانی گئی ہے۔

میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ اور مریدوں کی بہتری کے تقاضہ نے مجھکو یہ فہمائش کی ہے کہ میں انہی کی خاطر اپنی وقعت کا تحفظ بھی ملحوظ رکھا کروں۔ اور زیادہ خوش طبعی اور بے تکلفی روا نہ رکھوں۔

مگر ایک تو میں اپنی عادت بدل نہیں سکتا جو اب پختہ ہوگئی ہے۔ دوسرے مجھے اپنی وقعت میں وہ لطف نہیں آتا جو اظہار محبت میں آتا ہے اور تیسرے محبت کی بے تکلفانہ اطاعت کو رعب کی مجبورانہ اطاعت سے میں بڑھا ہوا سمجھتا ہوں۔

یہ صرف میری ذات تک محدود ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اسکو مجھی تک محدود رہنا چاہئے۔ ورنہ مشاہدہ یہ ہے کہ میں دوسروں کو اسکے خلاف نصیحت کروں۔ اور کہوں کہ جسکو دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اسکو ہر وقت کی ظرافت سے قطعی احتیاط کرنی چاہیے رسول خدا صلعم بھی (بلا تشبیہ) اپنے اصحابؓ سے خوش طبعی فرماتے تھے۔ اور ایسی

محبت کرتے تھے کہ ان میں سے ہر شخص یہی خیال کرتا تھا کہ حضرتؐ مجھ سے زیادہ کسی سے تعلق نہیں رکھتے۔ پھر بھی رعب کا یہ حال تھا کہ صحابہ ادب سے سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ ہم ایسے بیٹھتے تھے گویا ہمارے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں کہ ذرا گردن ہلائیں گے تو وہ اڑ جائینگی۔ یہ رعب قوت نبوت کا تھا۔ اور مادی نظر سے دیکھا جائے تو آنحضرتؐ صحابہؓ سے ہر وقت بے تکلف نہ رہتے تھے۔ اور بعض اوقات ان پر خفگی کا اظہار بھی فرماتے تھے۔

تیوری چڑھانا اور ناراضی کا اظہار چہرے سے کرنا۔ یا خفگی میں منہ پھیر لینا قرآن شریف سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ نے ایسا کیا۔ اور جب ہی کیا کہ اور موقعوں پر بھی ایسا کرتے ہوں گے۔ گو قرآن میں جہاں کہیں ذکر ہے وہاں اسکی مخالفت کی گئی ہے کہ ایسا اخلاق لوگوں سے نہ برتو۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں :- عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ اس سے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا تھا۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى تمہیں کیا خبر شاید وہ (تمہاری صحبت سے) پاکیزہ ہو جاتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن خشک و کرخت برتاؤ کو پسند نہیں کرتا اور لوگوں کی ہدایت و پاکیزگی خیالات و عقائد کو محبت کے برتاؤ میں سمجھتا ہے مگر یہ قرآن نے ایک خاص موقع کا ذکر کیا ہے اور سرکش بڑے درجہ کے آدمیوں سے غریب اور چھوٹے درجہ کے آدمیوں کو زیادہ توجہ کے قابل بتایا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی کے دخل در معقولات سے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا تھا۔ اس وقت آپ چند کافر سرداران قریش کو نصیحت کر رہے تھے۔ ابن مکتوم کو اسکی خبر نہ تھی انھوں نے مجلس میں آتے ہی آپ کو پکارا کہ یا رسول اللہ فلاں بات کیونکر ہے۔ آپ کو ان کا بولنا ناگوار ہوا۔ اور پیشانی مبارک پر شکن پڑ گئے۔ قرآن نے رسول خدا کو بھی ٹوک دیا کہ امیر کے مقابلہ میں غریب سے ایسا برتاؤ کیوں کیا کہ غریب ہی پاکیزہ بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

قیلولہ نہ کرنا

دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر سونا اور آرام کرنا قیلولہ کہلاتا ہے آنحضرت دوپہر کو قیلولہ ضرور کرتے تھے۔ اور یہ سنت ہے۔ مگر میں اس سنت پر بہت کم عمل کرسکتا ہوں۔ کیونکہ قیلولہ ان کو مناسب ہے جو تہجد کے وقت بیدار ہوتے ہوں یا رات کو زیادہ جاگ کر عبادت کرتے ہوں۔ میں رات بھر سوتا ہوں تو دن کو قیلولہ کرنے کی ضرورت مجھ کو نہیں ہے۔

میں نے سیاحت اور مسلمانوں کی زندگی کے مشاہدے سے یہ سمجھا کہ ان کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ دن کو بہت سوتے ہیں۔ امیر لوگوں پر تو خدا کا قہر ہے کہ وہ رات بھر حرام شغلوں میں جاگتے ہیں۔ اور دن بھر سوتے ہیں۔ مگر عوام مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس عام غریبی کے زمانہ میں دن کے وقت سونے کا رواج نکالا ہے۔ تہجد پڑھنے والے اگر قیلولہ کریں تو حرج نہیں ورنہ دن کو سونا زہر قاتل ہے۔ اس سے کاہلی اور سستی پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے لیئے یہ زمانہ ایسا کٹھن ہے کہ ان کو دن بھر مستعدی سے محنت کرکے روزی کمانی چاہیئے۔ ورنہ افلاس ان کا ستیاناس کر دے گا۔ مفلسوں کو جن کے بال بچے بھی ہوں تہجد پڑھنی یا رات کی عبادت کرنی جائز نہیں ہے۔ وہ رات بھر آرام سے سوئیں۔ اور دن بھر حلال روزی کمانے کے لیئے محنت کریں یہی ان کے نامہ اعمال میں عبادت ہو کر درج کی جائے گی کہ حلال روزی اور بال بچوں کا پالنا فرائض کے بعد سب سے بڑی عبادت ہے۔

غریب کا فروغ

جیسا کہ میں نے جگہ جگہ لکھا ہے کہ دنیا اور غریب آدمیوں سے ساتھ مجھے دلی ہمدردی ہے اور میں ان کو فروغ و ترقی میں دیکھنے کی دل سے تمنا رکھتا ہوں مگر تجربہ نے مجھ کو خبر دی ہے کہ پرانے غریب یعنی جو نسل در نسل سے مفلسی اور غربت میں بسر کرتے آئے ہوں ان کو ایک دفعہ ہی اعلیٰ درجہ پہ لے آنا خطرناک غلطی ہے۔ وہ اعلیٰ حالت میں آکر فرعون بن جاتے ہیں اور امیروں سے

بہت زیادہ خرابیاں انمیں ہو جاتی ہیں۔ وہ محنت سے بھاگتے ہیں۔ وہ کام سے دم چراتے ہیں۔ وہ آپ کو تیس مار خاں سمجھنے لگتے ہیں۔

ادنے اقوام میں جو لوگ عیسائی ہو گئے ہیں۔ انمیں جنکو اعلی تعلیم نہیں ملی سب ہی اس تماش کے دیکھے گئے کہ حد سے زیادہ شرابی۔ حد سے زیادہ نکمے۔ حد سے زیادہ مغرور اور حد سے بڑھ کر ظالم۔

یورپ میں سوشلزم اور بالشویک تحریک کا غلغلہ مچا ہے۔ اسکا اثر تمام دنیا میں پھیلیگا۔ کیونکہ دنیا امیروں کے مظالم اور خود غرضیوں سے عاجز ہو گئی ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ اثر پیدا ہو تو میرے اس مشاہدہ کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ ادنے اقوام کو ایکدم اعلیٰ درجہ میں ہرگز نہ لایا جائے۔ بلکہ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ ان کو بڑھانا مناسب ہوگا۔ پہلی بنیاد تعلیم کی ترقی ہے۔ اور پھر اقوام کے حسب مزاج پیشوں اور محنتوں کا رواج دینا ہے۔ موچیوں کو شائستہ موچی بناؤ وہ تحصیلداری کے قابل ہرگز نہیں ہیں۔ دھوبی کو تعلیم یافتہ دھوبی رکھو یا گھاٹ کا افسر بناؤ میونسپل کمیٹی کا چیرمین اسکو فوراً نہ کر دینا چاہیئے۔

امیر کا زوال

چند دن کی بات ہے دنیا کے سرکش دولت مند تباہ و برباد ہونیوالے ہیں۔ انمیں وہی سلامت رہیں گے جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں یا محنت سے بزرگوں کا روپیہ بچاتے اور جائز کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ باقی سب کا زوال آنے والا ہے۔

مجکو زندگی کے مشاہدات میں بہت زیادہ تکلیف دینے والی چیز یہ امیروں دولتمندوں کی جماعت نظر آئی۔ خاصکر ریاستوں کے مالک امرا بہت فضول معلوم ہوئے۔ یہ حد سے زیادہ عیاش حد سے زیادہ احمق۔ حد سے زیادہ خوشامد پرست۔ حد سے زیادہ خود غرض و خود مطلب اور حد سے زیادہ سفاک و جلاد ہوتے ہیں۔ ان کے نہ کھانے کا کوئی وقت ہے نہ سونے کا نہ کام کرنے کا۔ یہ نوکروں کو جانور یا گھانس پھونس سمجھتے ہیں اور اپنی ذات کی آسایش کے

سوا انہیں کسی کے آرام سے سروکار نہیں ہوتا۔ ان کو بیکار پڑے رہنے کے سبب بھوک نہیں لگتی اور نوکروں کو بھی یہ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اور ان کو فاقہ مرنا پڑتا ہے یہ یزید کے بچے ماتحت غریبوں کو بھوکا پیاسا اپنی غلامی کے لیئے دوڑاتے ہیں اور کسی ہم جنس پر ترس نہیں کھاتے خدا ان کو غارت کرے ان کو کسی بندۂ خدا پر رحم نہیں آتا۔ ان کا باپ مرجاتا ہے اور یہ اسکی گدی کے مالک بن جاتے ہیں۔ حالانکہ ریاست محنت کرنے والوں کا حق ہے۔ ورثہ کی چیز نہیں ہے۔ اگر یہ رعایا کی خبر گیری کریں۔ اگر یہ انصاف سے سبکے حقوق ادا کریں۔ اگر محنت اور جفاکشی ان کا شیوہ ہو۔ اگر یہ رعایا کی عورتوں کو اپنی ماں بہن سمجھیں۔ اگر یہ ملازموں سے بے وقت کی خدمت نہ لیں اگر یہ ظلم و ستم و عیاشی سے پاک ہوں تو یہ خدا کی رحمت ہیں۔ اور ان کی اطاعت خدا کا حکم ہے اور کوئی بلا زمین کی اور آسمان کی ان کو ستانے نہ پائے گی۔ ورنہ قہر الٰہی نمودار ہوگا۔ اور ان سب شریروں اور بدذاتوں کو نیست و نابود کر ڈالیگا۔ امیروں کے تجربے مجکو اتنے زیادہ ہوئے ہیں کہ کلیجہ پک گیا۔ ایک امیر کی بیگم نے میرے سامنے اپنی لونڈی کے ہاتھوں پر اینٹ آگ میں لال کرکے رکھدی۔ اور لونڈی بچاری کے ہاتھوں کی چربی نکل آئی۔ اور جب میں نے اسکو خدا کے غضب سے ڈرایا تو بیگم کے بھائی نے مجھ پر پستول اٹھایا۔ ایک امیر اپنی جوان و خوبصورت سوتیلی والدہ سے عشق بازی کرتا تھا۔ جب میں نے اسکو خدا کا حکم سنایا تو وہ نمرود کی طرح بگڑنے لگا اور حکم خدا کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

یہ لوگ دنیا کے لیئے پیروں کے پاس جاتے ہیں۔ دین کی طلب انہیں بہت کم ہوتی ہے اسیواسطے بزرگوں نے کہا ہے نعم الامیر علی باب الفقیر۔ و بئس الفقیر علی باب الامیر فقیر کے دروازے پر جانے والا امیر بہت اچھا اور امیر کے دروازہ پر جانے والا فقیر بہت برا اب فقیر لوگ امیروں کے دروازہ پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

میں خود اکثر امیروں کے ہاں جاتا ہوں۔ بہت سے امیر میرے مرید ہیں اور معتقد ہیں لیکن

میں انہی سے ملتا ہوں اور انہی کے پاس جاتا ہوں جنمیں یہ بری خصلتیں نہ ہوں۔ اور اگر کوئی بری بات ان امیروں میں دیکھتا ہوں تو نرمی یا ضرورت ہو تو سختی سے اسکو روکتا ہوں۔ کیونکہ میں ان امیروں کا محتاج نہیں ہوں۔ میری معاش ذاتی محنت پر منحصر ہے۔

سفارش

شفاعت کا ایک حصہ سفارش ہے۔ گزشتہ زمانہ کے فقرا بیکسوں مظلوموں اور حاجتمندوں کی سفارش کیا کرتے تھے۔ ہر بزرگ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفارش کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ میری بھی ابتدا سے یہ عادت ہے کہ میں سفارش چاہنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ان کی مدد کرتا ہوں۔ مگر تجربہ مجھکو یہ ہوا ہے کہ سفارش اہل مشرق خصوصاً مسلمانوں کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ دیسی ریاستوں میں "سازش اور سفارش" کے دو سین اور دو شین رات دن کام کرتے ہیں۔ سفارش نالائقوں کو بڑھاتی ہے۔ اور لائقوں کو برباد کرتی ہے کیونکہ نااہل اور ناقابل لوگ سفارش کے زور سے لیاقت والوں کا حق غصب کر لیتے ہیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ سفارش بعض موقعوں پر مظلوموں کا حق بچا لیتی ہے۔ یا بیکسوں کو مراد مند کر دیتی ہے مگر میرا دعویٰ ہے کہ زیادہ تر سفارش سے نقصان ہوتا ہے۔ مسلمان لیاقت حاصل نہیں کرتے صرف میل جول کی عادت ڈالتے ہیں تاکہ سفارش کی دولت حاصل ہو سکے۔ سفارش نے محنت و لیاقت کی صفات کو گھن لگا دیا ہے۔ اور مسلمان اس کے سبب دن بدن پستی میں گر رہے ہیں۔ مجھکو غیبی اشارات نے بتایا کہ سفارش توکل علی اللہ اور اپنی ذات کے اعتماد کی دشمن ہے اس سے مسلمانوں کو بچانا چاہئے۔ اسواسطے اب میں بہت احتیاط اور غور کے بعد سفارش کرتا ہوں اور اس بری عادت کو مسلمانوں سے دور کرنے کی سعی میں مصروف ہوں تاکہ رفتہ رفتہ یہ بلا دفع ہو۔

میں سمجھ جاتا ہوں جب ریاستوں کے بعض لوگ مرید ہوتے ہیں کہ ان کے مرید ہونے کی وجہ کیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض لوگ محض سفارش حاصل کرنے کو مرید ہوتے ہیں۔

قیافہ شناسی

ایک فن ہے جسکی مدد سے انسان دوسرے آدمی کی نیت عادت خصلت پہچان لیتا ہے مجھکو اسکا بچپن سے شوق تھا۔ اسکے متعلق میں نے کتابیں بھی پڑہیں اور رات دن تجربے بھی کیے۔ میں اکثر جیلخانوں کی سیر کرنے محض اسلیے گیا کہ مجرموں کی صورتوں کا تجربہ حاصل کر کے قیافہ شناس ہو جاؤں۔

یہ علم غلط نہیں ہے۔ غصہ۔ غم۔ خوشی۔ خوف۔ طمع کے اوقات میں ہر آدمی کا چہرہ معمولی نظر سے دل کی حالت بتا دیتا ہے۔ چہرہ کے اعصاب کھال میں ایک قدرتی آئینہ لگا ہوا ہے جسکو دیکھ کر آدمی اگر زبان ہلائے کی بات بتا سکتا ہے میں ایک نگاہ ڈالتے ہی انسان کے ارادہ اور اسوقت کے خیالات کو سمجھ جاتا ہوں دوستی اور دشمنی کے خیال کا حال ملاقاتی کی صورت ایک سکنڈ میں مجھ سے کہہ دیتی ہے بعض اوقات تجربہ اور مشاہدہ کی قوت سے میں انسان کے گذرے ہوئے سب حالات بیان کرتا چلا جاتا ہوں اور وہ عموماً سب درست ہوتے ہیں۔ اسکو میرا مکاشفہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ غلط ہے میں بتانا چاہتا ہوں کہ مکاشفہ فقیری کا کمال نہیں ہے اور میرا یہ کمال محض قیافہ پہچاننے پر منحصر ہے۔

مکاشفہ

اس موقع پر یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ جس شخص کے خیالات پراگندہ نہوں اور اشغال سے اس نے اپنی قوت خیال کو جمع کر لیا ہو تو اسکو دوسرے کے اور اپنے حالات کا کشف ہونے لگتا ہے اور وہ کسی غیر معمولی طریقہ سے نہیں بلکہ بالکل معمولی طور پر ذہن میں دوسرے کے حال کا ایک عکس مشاہدہ کرتا ہے اور جب اس عکس کو زبان پر لائے تو وہ ہو بہو دوسرے آدمی کی حالت معلوم ہوتی ہے مگر خیال کی قوت ہر وقت مجتمع رہ سکتی اسواسطے مکاشفہ بھی ہر وقت نہیں ہو سکتا۔ قیافہ شناسی ہر وقت ممکن ہے مگر مکاشفہ ممکن نہیں مجھکو ولیوں اور قبروں کے حالات مکاشفہ مذکور سے معلوم ہو جاتے ہیں تنہا مکانوں کو دیکھ کر بتا دیتا ہوں کہ انمیں کون کون رہتا ہے لیکن یہ ہر وقت نہیں ہوتا۔ نہ یہ اپنے اختیار کی چیز ہے کیونکہ جس خیال کے اجتماع پر اسکا انحصار ہے وہ ذاتی اختیار کی شی نہیں ہے۔

عادت ایک طاقت ہے

میں نے اپنی زندگی کے ہزاروں واقعات پر غور کرنے سے سمجھا ہے کہ عادت ایک بڑی طاقت ہے۔ دنیا میں تکلیف عادت کے سبب ہے اور راحت بھی

کم کھانا یا زیادہ کھانا عادت پر منحصر ہے۔ کھانے کو جتنا بڑھاؤ بڑھ جائے گا جتنا گھٹاؤ گھٹ جائیگا۔ سونا عادت ہے جتنا زیادہ سونے کی عادت ڈالو سوتے رہوگے۔ اور جب قدر کمی سونے میں کروگے ہوتی چلی جائیگی اور تمکو معلوم بھی نہ ہوگا۔ ڈاکٹر سات گھنٹہ کا سونا ضروری بتاتے ہیں۔ میں نے صرف دو گھنٹہ رات دن میں سونے والے دیکھے ہیں جنکی صحت اچھی تھی۔ نسل جاری کرنے کے لئے فطرت نے جو خواہش انسان میں رکھی ہے اسکی کمی زیادتی بھی عادت پر منحصر ہے۔

گرمی سردی کا اثر بھی عادت سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک آدمی ننگے پاؤں تیز دھوپ میں چار کوس پیدل چلا جاتا ہے دوسرا آدمی جسکو عادت نہیں ہوتی چار قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ایک آدمی پانچ سیر روٹی کا کھانا ڈہتا ہے دوسرا ایک چاول دو میں گزارہ کر لیتا ہے۔ مجھکو اس فلسفہ کا علم ہوا تو میں نے جفاکشی کی عادت کو آرام طلبی کی عادت پر ترجیح دی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مشقت اور موسموں کی شدت اور دنیا کے حوادث مجھکو تکلیف نہیں دیتے۔ اگر راحت خدا دیتا ہے تو اسکی خوشی دوگنی ہوتی ہے۔ اور تکلیف پیش آتی ہے تو عادت کے سبب اسکا اثر زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

توقع سے رنج و راحت

مجھکو زندگی نے بار بار سبق دیا کہ توقع کی بلندی پستی سے دنیا میں رنج و راحت پیدا ہوتے ہیں۔ میں جہاں سے ایک سو روپے حاصل ہونے کی توقع کرتا تھا۔ اور خلاف توقع پانچ کم سو ملتے تھے تو قدرتی طور پر مجھکو رنج ہوتا تھا۔ حالانکہ اگر میں دس کی توقع کرتا۔ تو یہی ۹۵ مجھکو خوش کر دیتے ہیں۔ قناعت توقع کی مرشد ہے اگر آدمی قناعت سے توقع کو ہدایت کرایا کرے اور توقع کو زیادہ بلند نہ ہونے دے تو اسکو دنیا کی کسی چیز سے تکلیف نہ پہنچے۔

منزل مشکل کے اندر ہے

حضرت بابا گنج شکرؒ کے مزار مبارک پر پاکپٹن شریف میں بارہا حاضر ہوا ہوں مگر ہمیشہ سواری میں گیا۔ مگر ایک دفعہ بارہ کوس پیدل چلکر حاضری دی تو دل میں وہ لذت تھی۔ اور مزار ایسا پر انوار اور فیض برسانے والا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے کبھی یہ بات میسر آئی تھی۔ میں نے سمجھا کہ منزل مشکل کے اندر ہے۔

گرمی کی مشکل روزہ افطار کر کے سردی کے موسم میں پچھلی رات کی نماز پڑھ کر اور محبوب شہید صاحب کے

بعد ملکر جو خوشی ہوتی ہے وہ اسکی دلیل ہے کہ مزا مشکل میں ہے اس مشاہدے نے مجکو مشکل پسند مشکل پرست - اور مشکل کا چرندہ بنا دیا ہے -

بے محنت کی دولت مدینہ شریف - بیت المقدس - اجمیر شریف - اور خود اپنی درگاہ میں دیکھا کہ جن لوگوں کو بطور نذر کے مفت کی دولت ملتی ہے ان کو اسکی لذت نہیں آتی - اور وہ لطف اسمیں نہیں ہوتا جو ایک ٹوکری اٹھانیوالہ مزدور چار آنہ حاصل کر کے مزا پاتا ہے - میں نے سمجھا محنت کے چار پیسوں میں وہ لذت ہے جو مفت کے چار سو روپے میں نہیں - اگر دولت لطف کے لیئے کمائی جاتی ہے - تو محنت سے کمانی چاہیئے -

اولاد کا ورثہ ہر جگہ تجربہ ہوا کہ ایک آدمی محنت کر کے پیسہ پیسہ جمع کرتا ہے - اور اولاد اسکو بے دردی سے آوارگی میں اڑا دیتی ہے - تجربہ نے مجکو نصیحت کی کہ اولاد کے لیئے سب سے اچھا ورثہ تعلیم و تربیت ہے

قرابت موت کے بعد ختم جن لوگوں کو اپنے بیوی بچوں کا فکر ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا وہ خدا کے انتظام کی بے حرمتی کرتے ہیں - اور خدا کی سرپرستی پر نکتہ چینی اور حملہ کا جرم ان سے سرزد ہوتا ہے - یہ رشتے اور قرابت داریاں زندگی کے فرائض ہیں - مرنے کے بعد وہ ختم ہو جاتے ہیں - اور خدا کی ذمہ داری میں آجاتے ہیں - آدمی کو اس کا فکر فضول ہے یہ مجکو باطن کے حکم نے بتایا -

دشمن بڑا دوست ہے میں نے دشمنوں کے ہجوم میں زندگی گزاری ہے اسلیئے میں کہتا ہوں کہ دشمن سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوست نہیں ہے - کہ اسکے سبب آدمی ہوشیار رہتا اور بدی سے بچنا اور نیک بننا سیکھتا ہے دشمن ہی اسکو ترقی کا جوش دلاتا ہے - دشمن ہی اسکی زندگی میں جان ڈالتا ہے -

دشمن کو مات کرنے کی چال جب دشمنوں نے مجھ پر حملے شروع کیئے تو میں نے ان پر وار کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ ان کاموں کو زیادہ زور شور سے کرنے لگا جن سے دشمنوں کو حسد تھا - اور حسد نے دشمنی پیدا کی تھی - اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ دشمنوں کو زک دینے کی بہترین چال یہی ہے کہ جس چیز سے دشمنی پیدا ہوئی ہے - اسکو ترقی دینی چاہئیے جس سے دشمن جل جلکر کباب ہونگے - اگر میں انکے جواب دینے یا ان پر وار کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ کام رک جاتا جس سے انکو حسد اور دشمنی تھی - اور میں گھاٹے میں رہتا اور دشمن نفع میں - خواہ میں ان کو کتنا ہی نقصان پہنچا دیتا - اب میں خدا کے سامنے منت میں سرخرو ہوں کہ میں نے حملہ نہ کیا اور

اپنے کام کی ترقی سے دشمن کو مغلوب کر لیا، کیونکہ میرے کام کا عروج ہی ان پر غلبہ پانا تھا۔

سادے پانی کا لطف بناوٹی پانی سوڈا لیمونڈ وغیرہ سب پیکر دیکھ لیئے جو مزا سادے پانی میں ہے وہ کسی پانی میں نہیں۔ اسی طرح جو لطف بے تکلف اور سادہ زندگی میں آتا ہے بناوٹ اور تکلف کی زندگی میں نہیں آتا۔ اسی واسطے مجھکو سادہ پانی اور سادہ زندگی پسند ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا مزا ریاست کے راجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا دنیا میں سب سے زیادہ مزا کس چیز میں ہے میں نے کہا کام میں۔ کام کرنے کے بعد جو سرور۔ نشہ اور مزا مجھکو آتا ہے وہ کسی شہنشاہ کو بڑا ملک فتح کرنیکے بعد بھی نہ آتا ہوگا۔

میرا جھوٹا کھانا جن لوگوں کو جھوٹی چیز کھانے سے پرہیز ہے ان کو اطلاع دیتا ہوں کہ میری ہر تحریر میرا جھوٹا کھانا ہے کیا اسکو لکھ کر اصلی ذائقہ میں چکھ لیتا ہوں اور جھوٹا دوسروں کے حصہ میں آتا ہے۔ دنیا میں ہر مصنف کا یہی حال ہے کہ لطف تو وہ خود اٹھاتا ہے اور بچی کھچی تلچھٹ دوسروں کو تقسیم کرتا ہے۔

الحمد للہ کہنے کا وقت چھینک آنے کے وقت زندگی میں ہزاروں مرتبہ الحمد للہ کہا ہوگا مگر مجھے اس الحمد للہ میں مزا نہیں آتا۔ سخت پیاس میں پانی کا گھونٹ پیکر۔ اور سخت بھوک میں روٹی کا نوالہ کھا کر۔ اور شدید گرمی میں ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا پا کر جب اصلی اور سچی خوشی سے الحمد للہ زبان پر آتی ہے وہ میری زندگی کی بے مثال دولت ہے۔

آنسو تزکیہ باطن کی بھٹی باطن کی اصلاح اور دل میں گدازگی پیدا کرنے کے لیئے میں نے کوئی عمل اور کوئی وظیفہ اتنا موثر نہیں پایا جتنے آنسو دیکھے۔ رونا انسان کا زنگ دور کرنے کی بھٹی ہے آگ لوہے کے زنگ کو دور کرتی ہے اور آنسو آدمی کی باطنی کدورت صاف کرتے ہیں جو قومیں ہنسنے پر ہنستی ہیں وہ ایک دن اپنے ہنسنے پر روئینگی۔

آپ بیتی لکھنی عرفان نفس کا کھاتا میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بھی کھاتہ لکھ رہا ہوں کیونکہ جب اسکو دیکھتا ہوں۔ آمد و خرچ کا حساب یاد آجاتا ہے۔ بس یہ آپ بیتی کی نوشت بھی مجھکو آگے چل کر (اگر میں زندہ رہا) زندگی کا حساب بتائے گی۔ ناظرین کچھ ہی سمجھیں میں نے یہ کتاب لکھ کر عرفان نفس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔